زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہار سو
راولپنڈی
مدیرِ اعلیٰ
سید ضمیر جعفری
صد برگ
خوشبو
انکار
خوہ کلامی

زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

چہارسو

راولپنڈی

جلد: ۳ — شمارہ - ۲۶ - ۲۷ : ستمبر: اکتوبر ۱۹۹۴ء

قیمت

فی شمارہ	——	18 روپے
چھ شمارے	——	104 روپے
زر سالانہ	——	200 روپے

بیرون ملک
(ہوائی ڈاک سے)

امریکہ۔ کینیڈا	40 ڈالر
برطانیہ	20 پونڈ
سعودی عرب	80 ریال
متحدہ عرب امارات	80 درہم
قطر	ایضاً
شارجہ	ایضاً

رابطہ۔ ۴۵۷۹-۲ گوالمنڈی راولپنڈی کینٹ۔ ۴۶۰۰۰ فون۔ ۵۲۰۵۷۹ فیکس

پبلشر: گلزار جاوید، طابع فیض الاسلام پرنٹنگ پریس مریڑ بازار راولپنڈی

ترتیب

ابھی سے میرے رفوگر کے ہاتھ تھکنے لگے

ابھی تو چاک مرے زخم کے سِلے بھی نہیں

قرطاسِ اعزاز

پروین شاکر

کے نام

پروین شاکر کیلئے

گلابی عمر کی شہزادیاں
سجری جوانی کی حدوں پر
چاہتے،
اور چاہے جانے کی تمناؤں میں
روشن خواب بُنتی ہیں۔
(مگر اظہار کرنے سے جھجکتی ہیں)

مبادا خواہشوں کی تتلیاں
رسوائیوں کی مٹھیوں میں
رنگ چھوڑ آئیں۔۔

—— تو پھر ایسے روپہلے موسموں
ان ساعتوں
کومل کنواری رانیوں کے
خواب بُنتے رخشِ خواہش کو
کسی شاعر
کسی دلدار کا اک لفظ ہی مہمیز کرتا ہے
کہو پروین شاکر
بات سچ ہے نا !؟

اگر سچ ہے
تو پھر جانو
کہ چڑھتی عمر کی دہلیز اندر
کسمساتی خواہشوں کے گنگ جذبوں کو
دھنک رنگی فضاؤں سے اترتی
دل دریچوں پر صدا دیتی
تمہاری جاگتی غزلوں
تمہاری پھول نظموں نے
زباں بخشی
سلیقہ بات کرنے کا سکھایا ہے۔

تمہارے حرفِ شیریں
اور مہکتی خوش کلامی نے
دلِ خوابیدہ میں بجتے ہوئے
سنتور پر
نغمے اتارے ہیں

امرِ خوشبو سے لے کر
ساحلِ "صد برگ" تک
پھیلے ہوئے نرمل سمندر سے
بہت سی ان کہی پیاسی تمناؤں نے
قطرہ قطرہ نوشِ جاں کیا ہے ——
—— پر سمندر پھر سمندر تھا
کہ اس کی تہہ میں
زندہ شاعری کی سیپیوں کا
اک خزینہ بھی پڑا تھا
جس کی غواصی کا جوکھم
قرض تھا تم پر ——

تو پھر جانو
کہ تم نے
"خود کلامی" کے عذابِ جانستاں کے باوجود
اس قرض کو
مثبت انا کی جنگ میں
"انکار" کے زندہ رویے سے اتارا ہے
سخن کے منطقوں پر
گزرے کل بھی تھی
تمہاری حکمرانی
آج بھی پرچم تمہارا ہے۔

حسن عباس رضا

Bio - Data

Name : Perveen Shakir
Date of Birth : 24-11-52
Place of Birth : Karachi

Education:

Harvard University	M.P.A.1992.
University of Karachi	M.A. English Linguistics.1980.
University of Karachi	M.A. English Literature(1972)
University of Karachi	B.A(Hons) English Literature.(1971)

Training:

Management Information system course,August 1992.
Lahore University of Management Sciences.

Civil Service Academy,Lahore.1982-1983.

National Institute of Customs and Excise,Karachi.
1983-84.

Experience:

Teaching

1990-1991

Fulbright Scholar in Residence,Hartford Consortium for Higher Education,Hartford,Connecticut.USA.

Courses Taught:

South Asian Literature (Trinity College).Hartford.

Literature, Film and Society-Soviet Union,China,Japan, Argentina,Greece,Brazil and Pakistan.(University of Hartford- Co-taught with Dr.Paul Stacy,Dr.Virginia Hale and Dr. Jane Edward)

Global Awareness:South Asia-Political and cultural history of Pakistan and Bangla Desh.(St.Joseph College) co-taught with Prof.Shamla Raman and Prof. Mary Ellen)

South Asian Literature.(Hartford College for Women)

1973-1982

Lecturer in English, Government Abdullah College for women, Karachi.

Administrative:

1984-1986
1986-1988
1988-1990

Assistant Collector of Customs, Customs House Karachi.
Second Secretary, Central Board of Revenue, Islamabad.
Assistant collector Excise and Sales Tax, and Assistant Director Administration, Rawalpindi Collectorate.

1992-

Deputy Collector, Customs, (Training) Islamabad.

Publications:

Report on the teaching of English Language- as member President's Commission on Languages, University Grants Commission, Islamabad, 1979.

Khushboo, Collection of Poems 1977.

Sadberg, Collection of Poems 1980.

Khudkalami, Collection of Poems 1985.

Inkar, Collection of Poems 1990.

Selected poems translated in English(Canada), German(Hamburg) and Arabic(Syria).

Selected Works of Ahmad Nadeem Qasimi(Translation in Collaboration with Leslie Levine)

Honors and Grants:

1991 Thomas Jefferson Fellowship for Edward S.Mason Program, Harvard.

1991 Sub-editor, Harvard News and Views. JFK School of Government. Harvard.

1990 Fulbright Scholar-in-Residence, Hartford Consortium for higher education.

1989 Faiz Ahmad Faiz International Award for poetry,New Delhi,India.

1990 President Pride of Performance Award for literature 1990,Pakistan.

1986 USIS Exchange Visitor Program,Meetings with top literary and academic figures of America,Tours of Ivy League Universities and cultural Centers.

1985 Dr.Sir Mohammad Iqbal Award for poetry ,Pakistan.

1978 Adamjee Award for the First Collection of Poetry.

1968-1971 Merit Scholarship University of Karachi.

1966-1968 Merit Scholarship Board of Higher Education, Karachi.

Media Involvement:

1972-1974 Columnist, Daily Jang, Karachi.

1993--- //

1971-to date Anchorwoman- Pakistan Television and Pakistan Broadcasting corporation for literary and cultural programs.

Foreign Languages:

Persian(proficiency in reading)
Arabic (proficiency in reading)
French (functional)

Membership:

Member Pakistan Arts Council Karachi.

Member ALTA(American Literary Translators Association)Texas.

Member International Women Writers' Guild,New York.

Member,Board of Governors,National Book Council, Ministry of Education,Government of Pakistan.

Executive Member,All Pakistan Women Athletics Association.University Grants Commission.Ministry of Education,Government of Pakistan.

براہ راست

گلزار جاوید

ہمیں اکثر ترقی یافتہ اقوام کے مقابلہ میں اپنی کم تر شرح خواندگی کا بڑا ملال ہوتا ہے اس آزردگی کے عالم میں ہماری ڈھارس بندھانے کے لیے چند ایسے چہرے آن موجود ہوتے ہیں جو سن و سال میں کمتر ہونے کے باوجود محنت، ہمت، لگن اور شوق کے باعث وطن کی سربلندی کی علامت بن جایا کرتے ہیں ان کا شوق اور جواں عزم انھیں اس قدر بلند و برتر مقام پر فائز کر دیتا ہے کہ ان تک دیکھنے والے کو نگاہ بھی بلند رکھنا پڑتی ہے۔ "محترمہ پروین شاکر" ایسی ہی پر عزم اور پر شوق صف کی نمائندہ شاعرہ اور دانشور خاتون ہیں جن کی تخلیقی خوشبو وطن اور وطن سے باہر چہار دانگ مہک رہی ہے آج کے زر پرست اور بے حس معاشرے میں فنون لطیفہ کی نسبت آواز سے ایک عالم کو تسخیر کر لینا یقیناً بڑا کارنامہ ہے ـــــــ ایسا کارنامہ جو بنی نوع انسان کے فلاحی کارناموں کی صف میں نمایاں مقام کا مستحق ہے۔

★ کہتے ہیں شاعری متعدی مرض ہے آپ کب اور کیونکر اس کا شکار ہوئیں؟

✻ غلط کہتے ہیں ------ میں نے 1968ء میں پہلی نظم لکھی یہ یوم دفاع پاکستان کے موقع پر تھی۔

★ دیکھا یہ گیا ہے کہ ہمارے کلچر زدہ لوگ انگریزی زبان میں تھوڑی سی شدبد حاصل کرنے کے بعد مغربی ادب کے دلدادہ اور پرچارک بن جاتے ہیں آپ ماشا اللہ دنیا کی مشہور ترین درسگاہوں کی فارغ التحصیل ہونے کے باوجود اردو ادب کو کیوں اوڑھنا بچھونا بنائے بیٹھی ہیں؟

✻ مجھے اپنی زبان، ادب اور کلچر کے بارے میں کبھی احساس کمتری نہیں ہوا۔

★ ہمارا ذاتی مشاہدہ ہے کہ آپ کے قاری اور مداح آپ کے بارے میں اتنا کچھ نہیں جانتے جتنی ان کے دل میں خواہش پائی جاتی ہے۔

✻ مجھے میری کتابوں میں ملیں۔

★ آپ کے لہجہ میں متانت، سنجیدگی اور ٹھہراؤ کس مکتب فکر کی دین ہے اور یہ بھی کہ آپ شاعری کی کس صنف کو محبوب گردانتی ہیں؟

✻ یہ چیزیں کسی مکتب فکر سے نہیں آتیں۔ مزاج کا حصہ ہوتی ہیں۔ ہر صنف

اچھی لگتی ہے لیکن غزل کی دلآویزی اپنی جگہ ہے۔

★ آپ کے ہاں اجتماعی مسائل کی نسبت ذات کا غم نمایاں نظر آنے کا سبب کیا ہے؟

✱ میری زندگی

★ کامیابی اور کامرانی کے لیے رہبر و رہنما کا وجود کس قدر ضروری خیال کرتی ہیں یا فقط صلاحیت اور محنت کے بل بوتے پر خود کو منوانے کی قائل ہیں؟

✱ دونوں چیزیں ضروری ہیں۔

★ رنگ' خوشبو' موسم' ماحول اور مزاج کونسی کیفیت تخلیق کے لیے مہمیز کام دیتی ہے؟

✱ اندر کا موسم

★ ایک نقطہ نظر خواتین کو چار دیواری کی زینت بنانے پر مصر دوسرا مردوں کے شانہ بشانہ مصروف کار رکھنے کا آرزو مند آپ ان میں سے کسی ایک سے متفق ہیں یا اپنا الگ تصور رکھتی ہیں؟

✱ میں ایک "ورکنگ وومن" ہوں اور یہی آپ کے سوال کا جواب ہے۔

★ پہلے باپ' پھر شوہر عورت کی شناخت کے یہ حوالے توہین نسواں کے زمرے میں نہیں آتے ------؟

✱ یہ تو بہت خوبصورت رشتے ہیں --- ان میں توہین کا پہلو کہاں سے نکل آیا؟

★ پردے کے بارے میں آپ کا تصور کیا ہے؟

✱ وہی جو میرے مذہب میں ہے ------- یعنی آنکھ کا۔

★ ہمارے ہاں اگر کسی کو ذرا سی شہرت مل جائے تو وہ ہر قیمت پر اسے کیش کرانے کی کوشش کرتا ہے آپ تو ماشاءاللہ خیبر سے کراچی تک ہردلعزیزی کے بلند مقام پر فائز ہیں آپ نے اس طرف توجہ کیوں نہ دی مطلب یہ کہ سیاست کو خود سے محروم کیوں رکھا ہوا ہے؟

✱ سیاست سے میری دلچسپی ایک طالب علم کی ہے اور بس۔

★ اردو زبان کے علاوہ آپ انگریزی' فرانسیسی' عربی اور فارسی میں بھی مہارت رکھتی ہیں اپنے ملک کی کسی بھی علاقائی زبان نے آپ کو اپنی جانب متوجہ نہیں کیا؟

✱ میں کسی زبان میں مہارت نہیں رکھتی۔ اور اپنے ملک کی تمام زبانیں اچھی لگتی ہیں۔ زندگی نے مہلت دی تو ضرور سیکھوں گی۔

★ ورکنگ ویمن ہونے کے سبب آپ نے بے شمار حیثیتوں میں اہم ذمہ داریاں نبھائی ہیں اور تخلیق میں بھی اپنا جداگانہ رنگ سب سے الگ اور نمایاں رکھا ہوا ہے مردوں کے اس معاشرے میں آپ کو کس قسم کی دشواریوں کا سامنا رہا؟

✱ جب تک ان کے INTERST'S clash نہ ہوں سب مہذب رہتے ہیں۔

★ عریانی اور فحاشی جیسے الفاظ اپنی وقعت کھو چکے آپ عمر عزیز کے جس حصہ میں ہیں وہ عورت کا انتہائی دلکش دور ہوتا ہے یعنی ماں' بیٹی' بہن اور رفیق حیات کے طور پر ذمہ دار پوزیشن پر فائز ہوتی ہے چاروں تصورات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ فرمائیے تخلیق کار بالخصوص صنف نازک کی آزاد خیالی کی حد کہاں سے شروع ہو کر کہاں ختم ہونی چاہیے؟

✱ بنیادی چیز شائستگی فکر ہے۔ حدود کا تعین خود ہو جاتا ہے۔

★ کیا ہمارا ادب اور ادیب واقعی گروہ میں بٹے ہوئے ہیں اس کے ذمہ دار کون لوگ ہیں عصری ادب کو اس روش سے کس قسم کے نقصانات کا سامنا ہے؟

✱ میرا خیال ہے گروپ بندی تو ہے۔ اس کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جن کے پاس بہت سا فالتو وقت ہوتا ہے۔ نقصان سارا ادب کا ہوتا ہے۔

★ آج کا شاعر' افسانہ نگار' مزاح نگار' ناول نگار' تنقید نگار اور ادبی جرائد کے مدیران میں سے کون زیادہ ذمہ دار ہے؟

✱ سبھی۔

★ انگریزی ادب کا آپ نے بغور مطالعہ کیا اردو ادب کی گہرائیاں بھی آپ کی وسعت نگاہ سے اوجھل نہیں کسی بھی طور ان کا تقابل کیا جا سکتا ہے؟

✱ عالمی معیار کا ادب دونوں زبانوں میں ہے۔

★ کیا یہ تاثر درست ہے کہ مغربی درس گاہوں سے فارغ التحصیل افراد کا مذہبی تصور کسی قدر تبدیل ہو جاتا ہے اور وہ لوگ روایتی مذہبی تعلیمات کے برعکس جدید نقطہ نظر کے حامی بن جاتے ہیں غیر جانبداری سے اس صورتحال کا تجزیہ کیجئے اور ساتھ ہی ذاتی کیفیات سے بھی آگاہ فرمائیے؟

✱ دو طرح کے رد عمل ہوتے ہیں یا آپ اپنے مذہب سے بہت دور ہو جاتے ہیں یا اتنے قریب کہ دوسروں کے مذاہب برے لگنے لگتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے میں ایسی کسی انتہا تک نہیں پہنچی۔

★ ترقی و غیر ترقی پسند کی اصطلاحیں کسی قدر معدوم ہو چکیں دائیں بائیں کی بحث بھی نظر نہیں آتی دنیا کے بیشتر "ازم" بھی نزاع کے عالم میں ہیں سیاست تو چلیئے چھوڑیئے ادبی صف بندی اور نظریاتی جنگ کی بنیاد اب کیا ہوگی اور ہاں یہ بھی واضح کیجئے کہ آپ کس سمت اور کس زاویہ پر کھڑی ہیں'

* میرے نقطہ نگاہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ویسی ہی Humane, Progressive ہوں اور مساوات پر جو یقین میرا پہلے تھا اب بھی ہے۔

★ کالم نگاری شروع کر کے آپ نے اپنے مداحین اور ناقدین کو امتحان سے دو چار کر دیا آپ کی نثر بھی اسی اعلیٰ تخلیق جوہر کی نمائندہ ہے۔ جس سے آپ کی سخن فہمی نمو پا رہی ہے اب فیصلہ کرنے والے کو شاعری کے، مقابلے میں آپ کی نثر کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا یہ صورتحال آپ کے فنی سفر کے لیے مفید۔ ہے یا مضر؟

* میرا خیال ہے ایسی کوئی بات نہیں۔ اور میں لکھنے کے معاملے میں سود و زیاں

ڈھاکہ ریڈیو پر

کے چکر میں کبھی نہیں پڑی۔

★ آج کے مشاعروں اور ان کے منتظمین سے سامعین کی اکثریت ناخوش ہے سنا ہے شاعرات کی اکثریت بھی کس قدر نالاں ہے کیا مسائل اور ذہنی تحفظات ہیں آپ کے؟

* مجھے نہیں معلوم۔ مجھے، تو کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔

★ آپ بے شمار علمی، ادبی اور ثقافتی اداروں کی ممبر یا سربراہی کی ذمہ داریاں اٹھائے ہوئے ہیں آپ کی وابستگی اعزازی ہے یا واقعی وہ لوگ آپ کی خدمات سے استفادہ کرتے ہیں اگر ایسا ہے تو یہ بڑی خوش آئند بات ہے مگر اس کے لیے آپ وقت کیونکر نکال پاتی ہیں؟

* لکھنے پڑھنے کے لیے وقت نکال ہی لیا جاتا ہے۔

★ خواندگی کی شرح شرمناک حد تک کم کتاب سے دشمنی کی حد تک بیزاری اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم نے زندگی کی رفتار کو تیز سے تیز تر کر دیا ہے اس ہیجانی کیفیت میں کم از کم اردو ادب کی کیا اہمیت و افادیت برقرار رہ جاتی ہے؟

* ادب کی اہمیت اس وقت بھی تھی جب شرح خواندگی اس سے بھی کم تھی بڑا ادب ہمیشہ relevant رہتا ہے۔ اردو ادب اس زمرے میں آتا ہے۔

★ خواہش ہماری تخلیق کار سے انٹرویو کی تھی مختصر جوابات کی صورت بیوروکریٹ کا پلہ بھاری رہا کیا ہمارا خدشہ واقعی درست ہے؟

* میں گفتگو ہی کم کرتی ہوں۔

★ وطن عزیز کے کسی بھی طبقہ سے اور کسی بھی موضوع پر آپ کچھ بھی کہنا پسند کریں تو ہمیں خوشی ہوگی

* اساتذہ اور پالیسی سازوں سے ایک استدعا ہے ------ تعلیم کو عام کریں ------ اب یہ ہماری ترقی کا نہیں بلکہ بقا کا مسئلہ ہے!

دریچۂ گل سے

خوشبو کا پیش لفظ :

گریزپا لمحوں کی ٹوٹتی ہوئی دہلیز پر، ہوا کے بازو تھامے، ایک لڑکی کھڑی ہے اور سوچ رہی ہے کہ اس سمے آپ سے کیا کہے۔ برس بیتے، گئی رات کے کسی ٹھہرے ہوئے سناٹے میں اس نے اپنے رب سے دعا کی تھی کہ اس پر اس کے اندر کی لڑکی کو منکشف کر دے۔ مجھے یقین ہے، یہ سن کر اس کا خدا اس دعا کی سادگی پر ایک بار تو ضرور مسکرایا ہوگا! (کچی عمروں کی لڑکیاں نہیں جانتیں کہ آشوبِ آگہی سے بڑا عذاب زمین والوں پر آج تک نہیں اترا) پر وہ اس کی بات مان گیا — اور اسے چاند کی تمنا کرنے کی عمر میں ذات کے شہرِ ہزار در کا اسم عطا کر دیا گیا!

شہرِ ذات — کہ جس کے سب دروازے اندر کی طرف کھلتے ہیں اور جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں!

بات یہ نہیں کہ فصیلِ شہرِ جاں کی زرد بیلوں پر کبھی کسی کا جمال بصورتِ سحاب نہیں اترا، یا اس شہر کی گلیوں میں زندگی نے خوشبو نہیں کھیلی — یہاں تو ایسے موسم بھی اترے کہ جب ہوا نے آنکھوں پر پھول باندھ دیے تھے اور حصارِ رنگ سے رہائی دشوار ہو گئی تھی — مگر جب ہوا کے دل میں برہنہ شاخیں گڑ جائیں تو بہار کے ہاتھوں سے سارے پھول گر جاتے ہیں!

انہی پھولوں کی پنکھڑیاں چنتے چنتے "آئینہ در آئینہ خود کو کھوجتی یہ لڑکی — شہر کی اس سنسان گلی تک آ پہنچی ہے کہ مڑ کر دیکھتی ہے تو پیچھے دور دور تک کرچیاں ہی بکھری ہوئی ہیں — ایسا نہیں ہے کہ اس نے اپنے عکس کو جوڑنے کی سعی نہیں کی — پر اس کھیل میں کبھی تصویر دھندلا گئی اور کبھی انگلیاں لہولہان ہو گئیں! اور "خوشبو" اسی سفر کی کہانی ہے! حیران آنکھوں، شبنمیں رخساروں اور اداس مسکراہٹ والی اس لڑکی کو اعتراف ہے کہ یہ کہانی نئی نہیں ہے (اور یہی کیا، دنیا کی کوئی کہانی نئی نہیں ہے — یہ تو ہمارے اندر کا کہانی کار ہے جو اس کو ایسا منتر دیتا ہے کہ سننے والے کا من موہ لے!)

پھر خود کو پانے کی جستجو میں اپنا آپ کھو دینا تو بڑی پرانی بات ہے — پر ہے بہت سچی اور کھری! ندرت جذبوں کے جمال کا معیار نہیں ہوا کرتی — جذبے کا حسن تو اس کی سچائی ہے اور اظہار کی دلکشی اس کا اعتماد ہے۔ سو یہ لڑکی بھی جب آپ سے بات کرے گی تو اس کی پلکیں بے شک بھیگی ہوئی ہوں گی — لیکن ذرا غور سے دیکھیے گا — اس کا سر اٹھا ہوا ہے!

رات کے پیاسے ہاتھوں سے اپنے خوابوں کا خالی جام کس نے واپس لیا ہے اور پھر اس صورت میں کہ جب وہ شکستہ بھی ہو! کرچیاں آنکھوں میں چبھی رہ جاتی ہیں — جن سے نئے دن کے سورج کی کرنوں کا ٹکراؤ، حدِ نگاہ تک رنگوں کے جال بچھاتا رہتا ہے — اور چشمِ خوں بستہ آنے والی رات ہو چکنے تک اس فریبِ سرور میں رہتی ہے کہ آزار گیا! اس خوش گمانی کا زہر جب تن بدن میں گھل جائے، تو جسم کے شہر پہ ایک موسم بڑی دیر تک ٹھہر جاتا ہے — زخموں کے پھول بننے کا موسم!

ہوا نے جب پھول کو چھوا تو خوشبو نے جنم لیا — خوشبو جو کھلتی ہوئی کلی کی مسکراہٹ بھی ہے اور مرجھاتے ہوئے شگوفے کا نوحہ بھی، جو ہوا کی سانسوں میں اتر کر خزاں نصیب درختوں کی مسیحائی کرتی ہے اور اس

انا میں محو جاں سے بھی گزر جاتی ہے، تو خبر ہو جاتی ہے کہ جنت کی طرح ہفت آسمان، دوستی کی طرح مہرباں، انیکی کی طرح یاد
رہنے والی اور رفاقت کی طرح دکھ بٹانے والی ہے، جو بچپن کی سہیلی کی طرح جلتے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیتی ہے
اور ماں کی طرح پل بھر میں موجود کے سارے دکھ چن لیتی ہے!

مگر ــــ جس کا مقدر وحشت ہے!
جس کے ماتھے پر ہوا کی انگلیوں نے بے سروسامانی لکھ دی ہے!
جس کا کوئی گھر نہیں!
جس کی زندگی کوچہ نوردی ہے، آبلہ پائی ہے، پریشان بدنی ہے!
اور جسے تھک کر کسی دیوار سے ٹیک لگانے، کسی چھاؤں میں آنکھیں موند لینے کی اجازت نہیں
کہ
سفر اس کا تعاقب کر رہا ہے

وجود کو جب محبت کا وجدان ملا تو شاعری نے جنم لیا ــــ اس کا آہنگ وہی ہے جو موسیقی کا ہے کہ
جب تک ساتوں سُر نہ چھیڑیں، نغمگی میں نور نہیں آتا! ــــ دل کے سب زخم لو نہ دیں تو حرف میں روشنی
نہیں آتی!

وجود کے سُر تیور بھی ہوتے ہیں اور کومل بھی ــــ تیور سُر عذاب لاتے ہیں اور کومل خواب! ــــ
کبھی چیخ ــــ کبھی کراہ ــــ کبھی سسکی ــــ اور کبھی گفتگو، کبھی سرگوشی اور کبھی محض خود کلامی! ــــ
"خوشبو" کی اونچی آواز آپ کو شاید ہی سنائی دے ــــ کہ عذابوں کی پذیرائی کرتے ہوئے بھی اس لڑکی
کے ہاتھوں میں گلاب ہی رہے ــــ مگر یہ بھی کہ اس صبا قامت سے پہلے ایک رات ضرور آتی ہے ــــ

اپنی آگ میں جل بجھنے کی رات! ــــ کہ اندر کی آگ خام مٹی کو ترو گل ــــ اور باہر کی تپش سے بڑھ گئی تو خشت
سویدا، بہشت بہبودی ہیر اپنی نرگس گئے اٹھا!

کچھ لوگ شاید یہ کہتے ہیں کہ اس لڑکی کی شاعری میں سوائے بارش کی ہنسی، پھولوں کی مسکراہٹ، چڑیوں
کے گیتوں اور اس کی اپنی سرگوشیوں کے، اور کچھ نہیں ــــ!

اگر زندگی سے محبت کرنا جرم ہے تو یہ لڑکی پورے غرور کے ساتھ اپنے جرم کا اعتراف کرتی ہے۔ نیم
عوامی کانسوں بڑی دیر سے گزرتا ہے ــــ پر جب ایسا ہوا تو روزن زنداں سے آنے والی، اجنبی سیاہ
بخت سرزمینوں کی ہوا کے آنسوؤں کو اس نے اپنی پلکوں پر محسوس کیا ہے۔ ان کا نمکین ذائقہ، اس کی شہد
آشنا زباں نے چکھا ہے لیکن یہ لڑکی بسنت بہار کی نرم ہنسی میں بھیگ بھیگ ہوا سے خزاں سے دکھ تو ہو سکتا ہے
ــــ عناد نہیں ــــ جس کے اکیلے گھر میں شریر چڑیا کا گیت چہرے آگیا ہو اسے سناٹے سے وحشت تو
ہو سکتی ہے، نفرت نہیں!

ہاں ــــ ضرور کہیں نہ کہیں بد صورتی بھی ہوگی ــــ مگر اس نے ایسا کبھی نہیں سوچا ــــ ماں سے
محبت کرتے ہوئے اس کا چہرہ نہیں دیکھا جاتا!

محبت جب تقاضائے جسم و جاں سے ماورا ہو جائے تو الہام بن جاتی ہے ــــ حسن جب لطافت
کی آخری حدوں کو چھو لے تو خوشبو بن جاتا ہے ــــ خوشبو حسن کی تکمیل ہے! اس سے کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھ
جائے کہ اس لڑکی کو تکمیلِ حسن کا دماغ ہے ــــ تکمیلِ حسن کا خیال صرف اسے زیب دیتا ہے جس نے تخلیق کو
کی ــــ البتہ اتنا ضرور ہے کہ آپ سے بچھڑنے سے پہلے یہ لڑکی "خوشبو" کا تعارف پورے اعتماد سے کرا
رہی ہے ــــ اس لیے کہ تخلیق کے تمام لمحوں میں وہ صرف اپنے وجدان کے سامنے جواب دہ تھی اور اس
کے وجدان نے اس کے کانوں میں یہی سرگوشی کی ہے کہ وہ لمحہ آگیا ہے جب وہ "خوشبو" کا ہاتھ ہوا
کے ہاتھ میں دے سکتی ہے

پروین شاکر

کراچی
ستمبر ۷۶ء

خوشبو سے انتخاب

پرزم

پانی کے اک قطرے میں
جب سورج اترے
رنگوں کی تصویر بنے
دھنک کی ساتوں قوسیں
اپنی بانہیں یوں پھیلائیں
قطرے کے ننھے سے بدن میں
رنگوں کی دنیا کھنچ آئے!

میرا بھی اک سورج ہے
جو میرا تن چھو کر مجھ میں
قوسِ قزح کے پھول اگائے
ذرا بھی اس نے زاویہ بدلا
اور میں ہو گئی
پانی کا اک سادہ قطرہ
بے منظر، بے رنگ!

PRISM

امر

ہم میں بھی نہیں وہ روشنی اب
اور تم بھی تمام جل بجھے ہو
دونوں سے بچھڑ گئی ہیں کرنیں
ویران ہیں شہرِ دل کی راتیں
اب خواب ہیں چاندنی کی باتیں
جنگل میں ٹھہر گئی ہیں شامیں!

لیکن
یہ جو دفعتاً اُدھر سے
گُلِ مہر کی شاخ کو ہٹا کر
ابھرا ہے اُفق پہ چاند میرا
اُس چاند کا حُسن تو وہی ہے!

کن رس

سر جھکی جھکی آنکھیں
یہ رُکا رُکا لہجہ
لب پہ بار بار آ کے
ٹوٹتا ہوا فقرہ
گرد میں اَٹی پلکیں
دھوپ سے تپا چہرہ
سر جھکائے آیا ہے
ایک عمر کا بھولا
دل ہزار کہتا ہے
ہاتھ تھام لوں اس کا
چوم لوں یہ پیشانی
ٹوٹنے نہ دوں تنہا
کوئی دل سے کہتا ہے
سارے حرف جھوٹے ہیں
اعتبار مت کرنا!
اعتبار مت کرنا!

○

کُو بہ کُو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اُس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

وہ کہیں بھی گیا، لَوٹا تو مرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی

تیرا پہلو، ترے دل کی طرح آباد رہے
تجھ پہ گزرے نہ قیامت شبِ تنہائی کی

اُس نے جلتی ہُوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا
رُوح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی

اب بھی برسات کی راتوں میں بدن ٹوٹتا ہے
جاگ اُٹھتی ہیں عجب خواہشیں انگڑائی کی

○

یارب! مرے سکوت کو نغمہ سرائی دے
زخمِ ہُنر کو حوصلۂ لب کشائی دے

لہجے کو جُوئے آب کی وہ نے نوائی دے
دُنیا کو حرف حرف کا بہتا سنائی دے

رگ رگ میں اُس کا لمس اُترتا دکھائی دے
جو کیفیت بھی جسم کو دے، انتہائی دے

شہرِ سخن سے رُوح کو وہ آشنائی دے
آنکھیں بھی بند رکھوں تو رستہ سجھائی دے

تخئیل ماہتاب ہو، اظہار آئینہ
آنکھوں کو لفظ لفظ کا چہرہ دکھائی دے

دل کو لہو کروں تو کوئی نقش بن سکے
تو مجھ کو کربِ ذات کی سچی کمائی دے

دُکھ کے سفر میں منزلِ نایافت کچھ نہ ہو
زخمِ جگر سے زخمِ ہنر تک رسائی دے

میں عشقِ کائنات میں زنجیر ہو سکوں
مجھ کو حصارِ ذات کے شر سے رہائی دے

پہروں کی تشنگی پہ بھی ثابت قدم رہوں
دشتِ بلا میں، رُوح مجھے کربلائی دے

مشترکہ دُشمن کی بیٹی

ننھے سے اک چینی ریستوران کے اندر
میں اور میری نیشنلسٹ کولیگز
کیٹس کی نظموں جیسے دلآویز دھندلکے میں بیٹھی
سُوپ کے پیالے سے اُٹھتی، خوش لمس مہک کو
تن کی سیرابی میں بدلتا دیکھ رہی تھیں
باتیں "ہوا نہیں پڑھ سکتی"[1] تاج محل، میسور کے ریشم
اور بنارس کی ساری کے ذکر سے جھلمل کرتی
پاک و ہند سیاست تک آنکلیں
پینسٹھ ۔ اُس کے بعد اکہتر ۔ جنگی قیدی ۔
امرتسر کا ٹی وی ۔
پاکستانی کلچر ۔ محاذِ نو ۔ خطرے کی گھنٹی ....

میری جوشیلی کولیگز
اس حملے پر بہت خفا تھیں

میں نے کچھ کہنا چاہا، تو
اُن کے منہ یوں بگڑ گئے تھے
جیسے سُوپ کے بدلے اُنہیں کونین کا رس پینے کو ملا ہو
ریستوران کے مالک کی ہنس مکھ بیوی بھی
میری طرف شاکی نظروں سے دیکھ رہی تھی
(شاید سنہ باسٹھ کا کوئی تیر ابھی تک اُس کے دل میں ترازو تھا!)

ریستوران کے نروز میں جیسے
ہائی بلڈ پریشر انساں کے جسم کی جیسی جھلاہٹ در آئی تھی
یہ کیفیت کچھ لمحے رہتی
تو ہمارے ذہنوں کی شریانیں پھٹ جاتیں
لیکن اُس پل، آرکسٹرا خاموش ہُوا
اور لتا کی رس ٹپکاتی، شہد آگیں آواز، کچھ ایسے اُبھری
جیسے حبس زدہ کمرے میں
دریا کے رُخ والی کھڑکی کھلنے لگی ہو !
میں نے دیکھا
جسموں اور چہروں کے تناؤ پہ
اَن دیکھے ہاتھوں کی ٹھنڈک
پیار کی شبنم چھڑک رہی تھی
مسخ شدہ چہرے جیسے پھر سنور رہے تھے
میری نیشنلسٹ کولیگز
ہاتھوں کے پیالوں میں اپنی ٹھوڑیاں رکھے
ساکت و جامد بیٹھی تھیں
گیت کا جادو بول رہا تھا !
میز کے نیچے
ریستوران کے مالک کی ہنس مکھ بیوی کے

[1] مشہور نظم: THE WIND CAN NOT READ

نرم گلابی پاؤں بھی
گیت کی ہمراہی میں تھرک رہے تھے !

مشترکہ دشمن کی بیٹی
مشترکہ محبوب کی صورت
اجلے ریشم لہجوں کی بانہیں پھیلائے
ہمیں سمیٹے
ناچ رہی تھی !

بارش ہوئی تو پھولوں کے تن چاک ہو گئے
موسم کے ہاتھ بھیگ کے سفاک ہو گئے
بادل کو کیا خبر ہے کہ بارش کی چاہ میں
کیسے بلند و بالا شجر خاک ہو گئے
جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے
لہرا رہی ہے برف کی چادر ہٹا کے گھاس
سورج کی شہ پہ تنکے بھی بے باک ہو گئے
بستی میں جتنے آب گزیدہ تھے سب کے سب
دریا کے رُخ بدلتے ہی تیراک ہو گئے
سورج دماغ لوگ بھی ابلاغِ فکر میں
زلفِ شبِ فراق کے پیچاک ہو گئے
جب بھی غریبِ شہر سے کچھ گفتگو ہوئی
لہجے ہوائے شام کے نمناک ہو گئے

ایک بُری عورت

وہ اگرچہ مطرب ہے
لیکن اُس کے دامِ صوت سے زیادہ
شہر اُس کے جسم کا اسیر ہے
وہ آگ میں گلاب گوندھ کر کمالِ آذری سے پہلوی تراشش
پانے والا جسم
جس کو آفتاب کی کرن جہاں سے چومتی ہے
رنگ کی پھوار پھوٹتی ہے !
اُس کے حسنِ بے پناہ کی چمک
کسی قدیم لوک داستان کے جال کی طرح
تمام عمر ناشعیدہ کو اسیرِ رنگ رکھتی ہے !
گئے زمانوں میں کسی پری کو مُڑ کے دیکھنے سے لوگ
باقی عمر قیدِ سنگ کاٹتے تھے
یاں — سزائے بازدید آگ ہے !
یہ آزمائشِ شکیبِ ناصحاں و امتحانِ زہد و اعطاں
دریچۂ مراد کھول کر ذرا جھکے
تو شہرِ عاشقاں کے سارے سبز خط
خدائے تن سے،
شب عذار ہونے کی دعا کریں
جواں لہو کا ذکر کیا
یہ آتشہ تو
پیرِ سال خوردہ کو صبح خیز کر دے !
شہر اس کی دلکشی کے بوجھ سے چیخ رہا ہے
کیا عجیب حسن ہے،

کہ جس سے ڈر کے مائیں اپنی کوکھ جائیوں کو،
کوڑھ صورتی کی بددعائیں دے رہی ہیں
کنواریاں تو کیا
کہ کھیلی کھائی عورتیں بھی جس کے سائے سے پناہ مانگتی ہیں
بیاہتا دلوں میں اس کا حُسن خوف بن کے یوں دھڑکتا ہے
کہ گھر کے مرد شام تک نہ لوٹ آئیں تو
وفاشعار بیبیاں دعائے نُور پڑھنے لگتی ہیں!

کوئی برس نہیں گیا،
کہ اس کے قرب کی سزا میں
شہر کے سبھی قداں
نہ قامتِ صلیب کی قبا ہوئے
وہ نہر جس پہ ہر سحر یہ خوش جمال بال دھونے جاتی ہے
اُسے فقیہہِ شہر نے نجس قرار دے دیا
تمام نیک مرد اس سے خوف کھاتے ہیں
اگر بکارِ خسروی
کبھی کسی کو اس کی راندۂ جہاں گلی سے ہو کے جانا ہو
تو سب کلاہ دار،
اپنی عصمتیں بچائے یوں نکلتے ہیں
کہ جیسے اس گلی کی ساری کھڑکیاں
زنانِ مصر کی طرح سے
اُن کے پچھلے دامنوں کو کھینچنے لگی ہیں
یہ گئی اماوسوں کا ذکر ہے
کہ ایک شام گھر کو لوٹتے ہوئے میں راستہ بھٹک گئی
مری تلاش مجھ کو جنگلوں میں لا کے تھک گئی

میں راہ کھوجتی ہی رہ گئی
اس ابتلا میں چاند سبز چشم ہو چکا تھا
جگنوؤں سے کیا امید باندھتی
مہیب شب ہراس بن کے جسم و جاں پہ یوں اُتر رہی تھی
جیسے میرے رُوئیں رُوئیں میں
کسی بلا کا ہاتھ سرسرا رہا ہو
زندگی میں — خامشی سے اتنا ڈر کبھی نہیں لگا!
کوئی پرند پاؤں بھی بدلتا تھا تو نبض ڈوب جاتی تھی
میں ایک آسماں چشیدہ پیڑ کے سیہ تنے سے سر لگائے
تازہ پتے کی طرح لرز رہی تھی
ناگہاں کسی گھنیری شاخ کو ہٹا کے
روشنی کے دو الاؤ یوں دہک اُٹھے
کہ ان کی آنچ میرے ناخنوں تک آ رہی تھی —
ایک جست —

اور قریب تھا کہ ہانپتی ہُوئی بلا
مری رگِ گلو میں اپنے دانت گاڑتی
کہ دفعتاً کسی درخت کے عقب میں چوڑیاں بجیں
لباسِ شب کی سلوٹوں میں چرمرائے زرد پتوں کی ہری کہانیاں لیے
وصالِ تشنہ کا کلال آنکھ میں
لبوں پہ ورم، گال پر خراش
سنبلیں کُھلے ہوئے دراز گیسوؤں میں آنکھ مارتا ہُوا گلاب،
اور بجلی ہُوئی سپید کہنیوں میں اوس اور دُھول کی مِلی جُلی ہنسی لیے
وہی بلا، وہی نجس، وہی بدن دریدہ فاحشہ
تڑپ کے آئی — اور —
میرے اور بھیڑیے کے درمیان ڈٹ گئی!

خود کلامی کی پروین

احمد ندیم قاسمی

جناب احمد ندیم قاسمی، جون ایلیا، فتح محمد ملک اور دیگر احباب کے ہمراہ۔

غالب کا ایک شعر ہے جو اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک انسان کے اندر جذبے کی سچائی زندہ ہے۔ شعر یہ ہے ؎

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں، اے خدا
افسونِ انتظار، تمنّا کہیں جسے

مجھے پروین کی شاعری اس شعر کا پھیلاؤ معلوم ہوتی ہے۔ جذبوں کی تکمیل اور خوابوں کی تعبیر کا انتظار جبھی ممکن ہے۔ جب انسان کے اندر تمنا کرنے کی صداقت ہو اس تمنا کے فن کارانہ اظہار میں حسن و دیانت ہو اور پھر اس تمنا کو عمر بھر زندہ و برقرار رکھنے کا حوصلہ ہو۔ تمنا کرنے یعنی انتظار کرتے رہنے کے اس طلسم نے ہومر سے لے کر غالب اور پھر آج تک کی اونچی، سچی اور کھری شاعری کو قلب انسانی کی طرح دھڑکنا سکھایا ہے اور پروین اس طلسم کاری سے اردو شاعری کو سچے جذبوں کی قوس قزحی، بارشوں میں نہلا رہی ہے۔

وہ جسے رومانیت کہتے ہیں۔ دراصل وہ سچ ہے جسے معاشرے کے بعض اندھے رواجوں اور مسلط نظاموں نے پامال کر رکھا ہے۔ سچا جذبہ، سچی بات اور سچا عمل ہی رومانیت ہے اور اس لفظ کے اصطلاحی مفہوم سے قطع نظر ہر وہ شاعر جس نے بڑی شاعری تخلیق کی ہے۔ اس حقیقت افروز رومانیت سے بہرہ اندوز ہے۔ اور آج اردو شاعری کی سرزمین پر پروین کی بیک وقت دلاویز اور دلگداز رومانیت، آسمان کی طرح چھا رہی ہے۔

جذبے کی جس سچائی سے پروین نے اردو شاعری کے قارئین کے دل و دماغ دونوں کو ان کی گہرائیوں کی آخری حد تک متاثر کیا ہے۔ وہ سچائی "خوشبو" میں اس کے ذاتی کرب کی ٹیس تھی ؎

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا!

"خوشبو" کی دلاویزی اور دلگدازی اس لئے لوگوں کو محبوب رہی کہ اس کے جذبوں اور لفظوں میں انہوں نے وہ آئینے دیکھے تھے۔ جن میں خدوخال کے علاوہ پس خدوخال کی کیفیات بھی منعکس تھیں۔

"صد برگ" میں اس سچائی نے ماورائے ذات کے آفاق پر بھی ایک دریچہ کھولا اور کہیں کہیں یہ سچائی اس طنز کا لہجہ بھی اختیار کر گئی۔ جو موجودہ صورت حالات سے نامطمئن حق گوئی کا لہجہ ہے ؎

ہنسی کو اپنی سن کے، ایک بار میں بھی چونک اٹھی
یہ مجھ میں دکھ چھپانے کا کمال کیسے آگیا
ابھی تو دھوپ روزنِ قفس سے کوسوں دور تھی
ابھی سے آفتاب کو زوال کیسے آگیا

اب "خود کلامی" میں سچائی کی اس دھار نے پروین کی شاعری میں ایسی کاٹ پیدا کرلی ہے کہ اس تصنع بھرے، ریاکار، منافق اور زرپرست معاشرے کا شاید ہی کوئی جھوٹ اس کی زد سے بچ رہا ہو۔ حیرت اور مسرت کی بات یہ ہے کہ پروین نے سیکڑوں میں پہچانے جانے والے اپنے لہجے کی انفرادیت کی قربانی دیئے بغیر اس تیز دھار کو بڑے موثر انداز میں استعمال کیا ہے۔

دل آزاری بھی اک فن ہے
اور کچھ لوگ تو
ساری زندگی اسی کی روٹی کھاتے ہیں
چاہے ان کا برج کوئی ہو
عقرب ہی لگتے ہیں
تیسرے درجے کے پیلے اخباروں پر یہ
اپنی یرقانی سوچوں سے
اور بھی زردی ملتے رہتے ہیں!

اور غزل کی زبان میں

کیا جاں کے خسارے کی تمنا ہو، کہ اب عشق
بڑھتا ہی نہیں درہم و دینار کے آگے

کچھ فیصلہ تو ہو کہ کدھر جانا چاہیئے
پانی کو اب تو سر سے گزر جانا چاہیئے

دل کے غزال کو سارا رم صحرا کی وسعت دیتی ہے
شہر رزق میں آنکلا اور ساری وحشت ختم ہوئی

"خوشبو" سے "خود کلامی" تک کا یہ سفر کتنے متنوع تجربوں، سوچ کی کتنی دیدہ و نادیدہ جہتوں اور حسن اظہار کے کتنے تیوروں سے آراستہ ہے۔ اس کا اندازہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جو شاعری کو ہر طرح کے تعصب اور جانبداری سے بلند ہو کر پڑھتے ہیں۔ پھر یہ شاعری اس لئے لائق توجہ نہیں ہے کہ اس میں نسائیت ہے۔ یا یہ نسائی سوچوں نسائی تجربوں اور نسائی مشاہدوں کی شاعری بھی ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ پروین اپنے عصر کے حقائق کی کیسی، کیسی نئی معنویتوں کو بظاہر کتنی سادگی اور بھولپن سے، مگر در اصل دانش و وجدان کی تمام ممکنہ رسائیوں کے ساتھ ایک نغمے کی طرح گنگنا دیتی ہے۔

صرف ذات کی تنہائی کے مسئلے کو لے لیجئے جو پوری بیسویں صدی کا مسئلہ ہے۔ مغرب و مشرق میں اس تنہائی نے درد مشترک کی صورت اختیار کر رکھی ہے مگر کرہ ارض کے ان دونوں حصوں میں رہنے والوں کے احساس تنہائی کے تناظر اور ان کے مضمرات یکسر مختلف ہیں۔ مغرب میں دو بڑی عالمی جنگوں اور پھر جوہری اسلحہ کی انجام ناشناس تیاریوں اور ہمہ گیر موت کے خوفناک امکان نے زندگی کو بے مفہوم اور اس طرح انسان کو تنہا بنا دیا ہے۔ مگر ادھر مشرق میں ہماری دقیانوسی معیشت اور بوسیدہ معاشرت، اور نظریاتی تنگ نظری اور مذہبی تعصبات کے سلسلے میں مبالغہ پسندی اور مغرب کی سائنس اور مادی ترقی کے سامنے اپنے احساس کمتری نے ہم پر اپنی اپنی تنہائی کے خول چڑھا رکھے ہیں۔ پروین نے "خود کلامی" کی ایک نظم میں اسے بجا طور پر "ہشت پایہ تنہائی" کہا ہے۔ اس لئے وہ اپنے تخلیقی ضمیر کے تقاضوں سے بے چین ہو کر کہتی ہے ۔

وہی تنہائی، وہ دھوپ، وہی بے سمتی
گھر میں رہنا بھی ہوا، راہ گزر میں رہنا

آلام حیات لوٹ آئیں
آسائشیں مجھ کو کھا نہ جائیں

سوچ کے پرندوں کو اک پناہ دیتا ہے
دھوپ کی حکومت میں ذہن کا شجر ہونا

بلیغ استعاروں اور بامعنی علامتوں سے سجی سنوری اس شاعری کو اگر محمد علی صدیقی کے سے نقاد نے "رجحان ساز شاعری" کہا ہے تو بالکل درست کہا ہے۔

"خود کلامی" کی پہلی غزل کا ایک شعر ہے ۔

اِس کو نہ پا سکے تھے، جب دل کا عجیب حال تھا
اب جو پلٹ کے دیکھیے، بات تھی کچھ محال بھی

پروین نے نہ صرف پلٹ کر دیکھنا اور حقیقت کا نیا ادراک حاصل کرنا شروع کردیا ہے بلکہ اب وہ پنجوں کے بل کھڑی ہو کر، مستقبل کے امکانات میں بھی جھانکنے لگی ہے اور یہ تمنا کے اس افسون انتظار کا کرشمہ ہے جس سے میں نے اپنی مختصر گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ تمنا ہی پروین کی شاعری کے طلسم کا کلیدی لفظ ہے.... یعنی،

شوقِ پرواز کا ٹوٹے ہوئے پر میں رہنا

اور تمنا کرتے رہنے کی یہ استقامت پروین کی وہ زبردست تخلیقی توانائی ہے جس نے بڑے بڑوں کو حیرت زدہ اور بعض کو تو خوف زدہ کر رکھا ہے۔

ناقد کہتے ہیں باہر کی بات کرو بھیتر کی مت کرو۔ صرف خاکہ لکھو ہم نے خاکے کے جو اصول متعین کر دیے ہیں۔ صرف آؤٹ لائن۔ اب اگر میں پروین کی آؤٹ لائن کی بات کروں۔ تو وہاں تو آؤٹ لائن ہی لائن ہے۔ ایسی آؤٹ لائن کہ جس کے چکر میں پڑ جاؤ تو باہر نکلنے کا رستہ نہ ملے۔ ملے بھی تو باہر نکلنے کو جی نہ چاہے۔

اس آؤٹ لائن کے چکر میں صرف میں آپ ہم ہی نہیں پھنسے ہوئے۔ خود پروین شاکر بھی پھنسی ہوئی ہے۔ باہر نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا۔ عجیب کش مکش میں گرفتار ہے' اس سے پناہ بھی چاہتی ہے۔ اس کا شکار مارے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔

اللہ نہ کرے کسی خاتون کی آؤٹ لائن جاذب نظر ہو۔ ہو تو وہ نظروں پر چڑھ جاتی ہے۔ اس کی زندگی اپنی نہیں رہتی۔ لاکھ پھونک پھونک کر قدم رکھے۔ خود کو احتیاط کی زنجیروں میں جکڑے' اماں نہیں ملتی۔

اور پروین کی بدقسمتی تو دو آتشہ ہے۔ آؤٹ لائن کے ساتھ ان لائن بھی
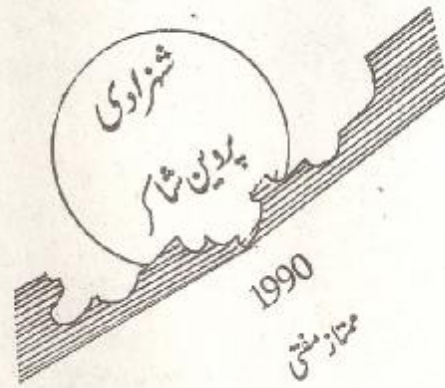
ہے۔ معمولی نہیں۔ بڑی گمبھیر ان لائن ہے۔ میرا مصور دوست آزر زوبی کہتا ہے مفتی لفظ کوئی چیز نہیں۔ زندگی تو لکیروں سے عبارت ہے۔ کچھ باہر کی کچھ اندر کی کچھ اوپر کی۔ کچھ خدوخال کی کچھ ذہنی رجحانات کی کچھ تقدیر کی۔ عام طور سے افراد کی زندگی میں ان تینوں میں سے کوئی ایک لکیر حاوی ہوتی ہے' پروین میں تینوں حاوی ہیں۔ باہر سے دیکھو تو وہ نازک اندام دھان پان لڑکی نظر آتی ہے۔ قریب جاؤ تو منظر یکسر بدل جاتا ہے۔ آپ کے روبرو ایک بالغ العقل' ہوش مند' زیرک' منفرد خیالات اور مضبوط کردار کی خاتون بیٹھی ہوگی۔

وہ سارے سے بے نیاز ہے۔ ہر بات میں منفرد رائے رکھتی ہے۔ مگر سہارا مل جائے تو کفران نعمت نہیں کرتی۔ تکلیف دہ دکھ بھرے ماضی کے باوجود اس کے اندر امید کا دیا روشن ہے۔ زندگی کرنے کا عزم موجود ہے۔ پروین کا کہنا ہے کہ وہ اپنے بیٹے مراد کے لئے جیتی ہے۔

سچ کہتی ہے' لیکن کبھی کبھی اس کے انداز کو دیکھ کر شک پڑتا ہے کہ اس میں خود کے لیے جینے کی شکتی بھی موجود ہے۔

گھریلو خوشی کے متعلق قدرت کا اصول سمجھ میں نہیں آتا۔ دانشور سوچ سوچ کر ہار گئے ہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اٹ از ناٹ ان دی فٹنس آف تھنگز' لیکن ایسا ہوتا ہے کہ زندگی میں "کوجھیاں گھر میں بیٹھی چوڑے چھنکاتی ہیں اور "سوہنیاں" ہو کے بھرتی ہیں۔

پنجابی میں ایک بول ہے ۔

گھر کوجھیاں دے چکن پرونڈھے
تے سوہنیاں دی اگ نہ بلے

حکما کہتے ہیں ٹھیک تو ہے سارا کھیل آگ کا ہے' حسن تو مفت میں بدنام ہے۔ بے شک حسن میں مرد کو کھینچ لانے کی شکتی موجود ہے' لیکن اپنا بنائے رکھنے کی قوت موجود نہیں۔

نیٹشے کہتا ہے ۔

Verily man loveth danger & play
50 loveth. The woman: The must
dangerous of all the play things.

پروین کی شخصیت کے تین پرت ہیں:۔

پہلا پرت دیکھو تو لطافت ہے' لے ہے' معصومیت ہے اور حیا کے جال ہی جال۔

دوسرا پرت دیکھو تو منظر ہی بدل جاتا ہے "لولی" وینس ڈی مائیلو SPINEX بن کر بیٹھ جاتی ہے۔ ذہنی پختگی' مردانہ جرات اور CRUDEREALISM

جبھی سیانے سمجھدار پہلے پرت پر ہی گزارہ کر لیتے ہیں۔ ذاتی تحفظ یا ڈر کے مارے فاصلے قائم رکھتے ہیں۔ تیسرا پرت پیش منظر نہیں پس منظر ہے۔ دکھ کی ایک بے نام بھیگ جو ساری شخصیت میں لرزتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

پروین شاکر کی پرنم شخصیت کو دیکھ کر لگتا ہے جیسے دکھ کے پانیوں میں گھرا ہوا ایک سرسبز جزیرہ ہو' لیکن اس کی آنکھ میں ایک ایسی نگاہ بھی ہے جو چلتی آندھی کو باندھ سکتی ہے' دریا کا رخ موڑ سکتی ہے۔

کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے اس کی پرنم شخصیت جاذب کیفیت کے علاوہ ایک ہتھیار بھی ہو۔

پھول پر شبنم کے قطرے دیکھ کر کبھی کبھی شک پڑتا ہے کہ دکھ ایک سنگھار بھی ہے۔ ایک انوکھا مگر زوداثر کا سمنگھ۔ پروین کی کہانی بہت ہی سادہ ہے۔

وہ بہارن ہے۔ بہارنیں جسمانی طور پر دھان پان ہوتی ہیں لیکن اتنی تیکھی کہ سوئی کی طرح چبھ جاتی ہے۔ کٹر شیعہ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔

شیعہ خاندان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہاں آنکھ کھلتے ہی۔ روایت ہوتی ہے۔ کلام ہوتا ہے۔ ردھم ہوتا ہے۔ لے ہوتی ہے۔ جذبہ ہوتا ہے۔ دکھ ہوتا ہے۔ میرانیس ہوتا ہے۔

پروین اسی ماحول میں پل کر جوان ہوئی۔ پھر قدرت نے اس میں تخلیقی کلی ٹانک دی۔ تخلیقی صلاحیت ہوتی تو خوب ہے لیکن الیہ اثرات کی حامل ہوتی ہے' نارمل زندگی بسر کرنا ممکن نہیں رہتا۔

دانشور اس سامنے دھری حقیقت کو ماننے کے لئے تیار نہیں کہ وہ کیفیت جسے "ہیپی نس" کہا جاتا ہے صرف میڈیا کو نصیب ہے۔ لگتا ہے کہ قدرت نے شعراء کو سکھی زندگی بسر کرنے کے لئے پیدا نہیں کیا۔ وہ جو زندگی کی انڈر بیٹ (UNDER BEAT) کو سننے کی حس سے نوازے جاتے ہیں انہیں ذاتی زندگی بسر کرنے سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ بانسری میں چھید اس لئے ڈالے جاتے ہیں کہ سر پیدا ہو۔

پروین شاکر کی بد قسمتی ہے کہ وہ نوازی گئی ہے۔ جو نوازے جاتے ہیں ان پر اکلاپا مسلط کر دیا جاتا ہے۔ ذاتی خوشی چھین لی جاتی ہے۔

دکھ درد کی ایسی سرنیاں سرتیاں لگا دی جاتی ہیں کہ وہ ہر لحظہ چھن چھن کرتی رہیں۔

بیچاری قدرت ــــــــــــ

پروین شاکر کو سر کرنے میں اسے کیا کیا جتن کرنے پڑے خانہ آبادی کی عمومیت سے بچانے کے لئے میاں کے ساتھ ان بن کا کانٹا لگا دیا۔ پروین کی طبیعت میں زود حسی کی بیخ لگا دی ایسی کہ نارمل ازدواجی تعلقات کی متحمل نہ رہے۔ یہ سب اس لئے کہ علیحدگی کے سوا چارہ نہ رہے۔

محبوب کو پروین کے انگ انگ میں رچا کر دونوں کے درمیان سماج کی دیوار کھڑی کر دی۔ اور اب ــــــ اب جب کہ وہ سماجی آزادی' ذہنی پختگی' کرداری استحکام کی سرتیوں سے آراستہ ہے اور اس بات کا خطرہ لاحق ہے کہ پھر سے خانہ آبادی پر مائل ہو جائے قدرت نے اس کے دل میں غیر عقلی اندیشے پیدا کر دیے ہیں۔

کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے۔

قدرت نے اس کے ذہن کو اس حد تک مسخر کر رکھا ہے کہ وہ اپنی تازہ تصنیف کا نام انکار رکھنے پر مجبور ہے۔ صاحبو شعراء نے ہمیں کنفیوز کر رکھا ہے۔

آج تک ہم پہ یہ بھید نہیں کھلا کہ عاشق کون ہے محبوب کون ہے؟

شاعر کہتے ہیں عاشق ہم مرد لوگ ہیں۔ عشق کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ نازک اندام خواتین عشق کے کٹھن مطالبات سے عہدہ براء نہیں ہو سکتیں۔

خواتین کہتی ہیں مردوں کی بات نہ سنو۔ انہیں بڑ مارنے کی پرانی عادت ہے۔ انہوں نے زبردستی غنڈہ گردی کے زور پر عشق کے رول پر قبضہ کر رکھا ہے۔ عشق ایک کیفیت ہے جسے کرنے سے نہیں بلکہ سہنے سے تعلق ہے۔ مجنوں بن کر دشت پیمائی کرنا یا رانجھا بن کر بھینسیں چرانا عشق نہیں ہوتا۔ عشق کرنا تو صرف عورت جانتی ہے۔

نفسیات کے ماہر کہتے ہیں کہ مرد تو بار موہیم کی مصداق ہوتا ہے انگلی رکھ دو تو سر بجتا ہے اٹھا لو تو ختم ہو جاتا ہے اور عشق تو ایک تسلسل ہے ــــ مسلسل جذبہ ــــ آتا جاتا نہیں۔

اس کے برعکس عورت تو تار ہیں ہی تار ہیں ہے۔ ایک بار چھڑ جائے تو چھڑی رہتی ہے۔ مجھے شاعرات سے شکایت ہے کہ انہوں نے اپنی تخلیقات میں صرف انسانی جذبات کا ذکر کیا ہے نسائی جذبات کا نہیں۔ پروین نے اپنے کلام میں نسائی جذبات پر بات کی ہے کھل کر نہیں۔ یہاں وہاں کہیں کہیں اشارت میں ــــ کہتی ہے عورت بیک وقت عاشق بھی ہے اور محبوب بھی۔ مرد تو صرف مضراب ہے جو چھیڑ کر الگ ہو جاتا ہے۔ اشفاق احمد ورک نے جو پائے کا مزاح نگار ہے خوشبو والی شاعرہ کے عنوان سے پروین شاکر کا خوب صورت خاکہ لکھا ہے۔

اس دنیا میں غزل کی وجہ آغاز عورت اور عورت کی وجہ آغاز مرد ہے اور اب یہ تینوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہو چکے ہیں۔ اردو شاعری کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو مردوں کے ساتھ خواتین شاعرات کی بھی کمی نہیں مگر ان میں سے اکثر کے ہاں شاعرہ بولتی ہے تو عورت غائب ہو جاتی ہے اور عورت کی آواز سنائی دیتی ہے تو شاعرہ پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ یہ پہلی خاتون شاعرہ ہے جس کے ہاں عورت اور شاعرہ قدم سے قدم ملا کر چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ پروین شاکر کے کلام کے متعلق ورک لکھتا ہے:۔

پروین شاکر کو زبان پر پوری گرفت ہے۔ اردو زبان پر اور اپنی زبان پر بھی۔ یہی وجہ ہے کہ الفاظ اور اشارات اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے رہتے ہیں۔ جو چاہتی ہے لکھ دیتی ہے۔ لوگ بھی وہی چاہتے ہیں' جو لکھ دیتی ہے۔

اتنی سی عمر میں اس نے اتنے کام کر لیے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ آگے چل کر کیا کرے گی' کیا نہیں کرے گی جب کہ میرے دوست مسٹر الو کا کہنا ہے کہ ایسے کام صرف اسی عمر میں ہو سکتے تھے۔

(پروین شاکر کی نئی کتاب (انکار" کی تقریب اجراء منعقدہ اسلام آباد میں پڑھا گیا)

نئی خوشبو

سردار جعفری

مہتاب راشدی کے ہمراہ

سماعتوں کو نوید ہو .... کہ
ہوائیں خوشبو کے گیت لے کر
دریچہ گل سے آرہی ہیں۔

خوشبو' لاہور سے کراچی تک پھیلی ہوئی تھی۔ اردو شاعری کے باغ میں ایک نئی کلی کے کھلنے کی خبر تھی۔ میں نے ایک شام پاکستان کے مشہور مصور صادقین کے اسٹوڈیو میں گزاری۔ میز پر نظموں کی ایک نئی کتاب "خوشبو" رکھی تھی جس کا گرد پوش صادقین نے بنایا تھا' شاعرہ کا نام پروین شاکر تھا۔ فیض نے ساڑھے تین سو صفحات کی کتاب ہاتھ میں اٹھا کر دیکھی اور مسکرا کر کہا کہ میں نے تو عمر بھر میں اتنی نظمیں نہیں کہی ہیں۔ صادقین نے اس طرح نئی شاعرہ کی حمایت کی کہ پروین شاکر زیادہ کہتی ہے لیکن اچھا کہتی ہے۔

12 دسمبر کو جب میں لاہور سے کراچی جا رہا تھا تو ہوائی جہاز میں احمد ندیم قاسمی میرے ہمسفر تھے جو "خوشبو" کی رونمائی کے لئے جا رہے تھے۔ پاکستان میں کتاب کے اجراء کو رونمائی کہتے ہیں۔ ہمارے ہندوستان کے شہر حیدر آباد میں اس کو جشن اجرائی کہا جاتا ہے۔ اس ایک دوست کے گھر پر یہ کتاب پھر میرے سامنے آئی۔ پاکستان کے مشہور و مقبول طنز نگار مشتاق احمد یوسفی اس جشن میں شریک ہوئے تھے۔ اور پروین کی شاعری کی تعریف کر رہے تھے۔ جشن رونمائی میں پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں نے دل کھول کر اس نئی شاعرہ کو داد دی۔ برصغیر کے بزرگ شاعر اور افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی نے کہا:

پروین! جذبے کی شدت اور شائستگی کی شاعرہ ہے' جذبے کا سچا' کھرا اور خوبصورت اظہار اس کی شاعری کا کرشمہ ہے' نہ وہ اپنے آپ کو فریب دیتی ہے اور نہ اپنے قاری سے کچھ چھپاتی ہے۔ اس نے محبت کے جذبے کی حیرت انگیز تہذیب کی ہے' پروین نے اس پامال موضوع کو رفعت بخشی ہے اور اس کی قدامت کو بدل دیا ہے...... اس نے اپنے پسندیدہ موضوع کو نہیں بنالیا ہے بلکہ اس کا دلاویز فن ہمہ وقت چار سو نگراں رہتا ہے' پروین کی آواز کے زیر و بم میں روح عصر کی گونج صاف سنائی دیتی ہے' اردو شاعری میں یہ ہر لحاظ سے ایک'
نئی آواز ہے'
منفرد'
جمیل'
اور
مستقبل گیر آواز۔"

اور پروین کی پیش رو فہمیدہ ریاض نے اس کی شاعری کے جمالیاتی پہلو کو ان الفاظ میں روشن کیا۔

"زندگی کو بے حس بنا دینے والے روز مرہ سے چند لمحے بچا کر' آپ کبھی کسی کنج عافیت میں سکون سے بیٹھے ہیں؟ اور پھولوں پر منڈلاتی' ٹھہرتی' پنکھ جوڑتی اور

کھولتی تتلی کو غور سے دیکھا ہے؟ اس کے نرم 'نازک 'سبک پروں پر پھیلتی 'ایک دوسرے میں گھلتی 'رنگوں کی لکیروں کو کانپتے دیکھا ہے؟

پروین شاکر کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ خوشبو اس ہولے سے تھرتھراتے ہوئے تتلی کے پنکھ کا ہی دوسرا نام ہے۔"

دوسرے دن 13 'دسمبر کی شام کو پروین شاکر سے ملاقات ہوئی 'پاک ہند دوستی انجمن نے مجھے مدعو کیا تھا۔ وہاں کراچی کے بہت سے ادیب و صحافی اور سماجی کارکن جمع تھے۔ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے کمیشن کے پاکستانی چیئرمین علانہ صاحب آئے تھے جو انگریزی زبان میں شاعری کرتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے ساتھ آئی ہوئی ایک چوبیس 'پچیس سال کی خوبصورت لڑکی نے "خوشبو" کا تحفہ مجھے دیا۔ اس میں حسن وانکسار تھا 'میں نے پروین سے کہا کہ کتاب کے صفحات پر چھپے ہوئے شعروں کے پیچھے جو آواز ہے وہ کب سنائی دے گی۔ اس نے یہ کہہ کر شعر سنانے کا وعدہ کیا کہ "آج مجھے کہیں اور جانا ہے دعوت پر 'دو ایک دن میں شعر سنانے کا موقع نکل آئے گا۔"

پروین کی شاعری کا محور عشق ہے 'اس کی تشبیہیں اور استعارے زیادہ تر فطرت سے لئے گئے ہیں۔ دھوپ 'سورج 'چاند 'روشنی 'پھول 'بادل 'پانی 'ہوائیں انہیں سے مل کر اس کی امیجری کی تعمیر ہوئی ہے۔ لیکن اس کے عشق کے گرد شعور کا ایک خوبصورت ہالہ ہے 'سماجی اور سیاسی احساس کا پرتو ہے 'اس کی شاعری حسن صورت 'حسن سیرت 'حسن زبان اور حسن بیان سے آراستہ ہے اس لئے اس میں دور دور تک کہیں اس عہد کی مردم بیزاری نہیں ہے۔ ذاتی تلخی اور خیال کے الجھاوے نہیں ہیں۔ وہ بصیرت ہے جو زندگی کو شائستہ بناتی ہے اور انسانی تہذیب کو وقار بخشتی ہے 'لہجے کی تازگی میں بلا کی کشش ہے۔

دو 'دن بعد کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو نے مجھے مدعو کیا 'وہاں پروین شاکر کی ایک نظم اور ایک غزل سننے کا موقع ملا۔ جلسے کی صدارت حضرت مجنوں گورکھپوری فرما رہے تھے۔ پروین آہستہ آہستہ اور مہذب آواز میں پڑھتی ہے۔ اور یہ آواز اس کی شاعری کے لئے ترنم سے زیادہ اثر انگیز ہے۔

خاکم بدہن

سرکار!

ہم تو آپ کے ایماں نثار تھے
ہر مقتلِ جفا میں لہو کے شریک تھے
کم پوشیٔ قبا میں رفو کے شریک تھے
دِل آپ کا دُکھا ہے تو آنسو ادھر بہے

چوٹ آپ کو لگی تھی مگر نیل کب پڑے
اپنی ہی سمت کھینچا ہوا تیر ہم بھی تھے
اپنے خلاف دی ہوئی تعزیر ہم بھی تھے
لیکن یہ دُکھ بہت تھا کہ کچھ معتبر تو ہیں
منزل نہیں ہیں آپ کی گردِ سفر تو ہیں
یہ کیا کیا کہ گردِ سفر بھی نہ اُٹھ سکے
چشم خطا سے بارِ نظر بھی نہ اُٹھ سکے
اب تک تو شہرِ جاں پہ عذاب آئے تھے مگر
اب کے تو اعتبار کی دنیا اُجڑ گئی
ماتھے پہ بَل نہ آنے دیا تھا کبھی تو پھر
لہجے میں اتنی گہری شکن کیسے پڑ گئی

غزل

پابہ گِل ہیں سب رہائی کی کرے تدبیر کون
دست بستہ شہر میں کھولے مری زنجیر کون
میرا سر حاضر ہے لیکن میرا منصف دیکھ لے
کر رہا ہے میری فردِ جرم کو تحریر کون
آج دروازوں پہ دستک جانی پہچانی سی ہے
آج میرے نام لاتا ہے مری تعزیر کون
کوئی مقتل کو گیا تھا مدتوں پہلے مگر
ہے درِ خیمہ پہ اَب تک صورتِ تصویر کون
میری چادر تو چھنی تھی شام کی تنہائی میں
بے ردائی کو مری پھر دے گیا تشہیر کون
سچ جہاں پابستہ ملزم کے کٹہرے میں ملے
اس عدالت میں سنے گا عدل کی تفسیر کون
نیند جب خوابوں سے پیاری ہو تو ایسے عہد میں
خواب دیکھے کون اور خوابوں کی دے تعبیر کون
ریت ابھی پچھلے مکانوں کی نہ واپس آئی تھی
پھر لبِ ساحل گھروندے کر گیا تعمیر کون
سارے رشتے ہجرتوں میں ساتھ دیتے ہیں مگر
شہر سے جاتے ہوئے ہوتا ہے دامن گیر کون

دشمنوں کے ساتھ میرے دوست بھی آزاد ہیں
دیکھنا ہے، کھینچتا ہے مجھ پہ پہلا تیر کون

کراچی سے بمبئی روانگی سے دو دن پہلے سرسید کالج میں پروین شاکر سے پھر ملاقات ہوئی۔ کالج کی پرنسپل نے نہایت فخر اور محبت سے اس کا ذکر کیا۔ ""اس کالج نے ایک بہت اچھی شاعرہ پیدا کی ہے۔" پروین نے ""مشترکہ دشمن کی بیٹی"" یہ کہہ کر پیش کی کہ میں جعفری صاحب کی موجودگی میں یہ نظم سنانا چاہتی ہوں ان سادہ الفاظ میں ہندوستان کے لئے محبت اور دوستی کا پیغام تھا۔ یہ پیغام پاکستان کی نئی نسل کی طرف سے ہے۔ جس نے صرف ہندو کا نام سنا ہے اس کی صورت نہیں دیکھی۔

""مشترکہ دشمن کی بیٹی""

ننھے سے ایک چینی ریستوران کے اندر
میں اور میری نیشلسٹ کولیگز
کیٹس کی نظموں جیسے دلآویز دھندلکے میں بیٹھی
سُوپ کے پیالے سے اٹھتی خوش لمس مہک کو
تن کی سیرابی میں بدلتا دیکھ رہی تھیں
باتیں "ہوا نہیں پڑھ سکتی" "تاج محل" میسور کی ریشم
اور بنارس کی ساری کے ذکر سے جھلمل کرتی
پاک و ہند سیاست تک آنکلیں
پینسٹھ.... اس کے بعد اکہتّر.... جنگی قیدی
امرتسر کاٹی۔ وی...
پاکستانی کلچر... محاذ نو...... خطرے کی گھنٹی.....
میری جو شیلی کولیگز
اس جملے پر بہت خفا تھیں
میں نے کچھ کہنا چاہا تو
اُن کے منہ یوں بگڑ گئے تھے
جیسے سُوپ کے بدلے انہیں کونین کا رس پینے کو ملا ہو
ریستوران کے مالک کی ہنس مکھ بیوی بھی
میری طرف شاکی نظروں سے دیکھ رہی تھی
(شاید سنہ پینسٹھ کا کوئی تیر ابھی تک اس کے دل میں ترازو تھا)
ریستوران کے ترونز میں جیسے
ہائی بلڈ پریشر انسان کے جسم کی جیسی جھلاہٹ در آئی تھی
یہ کیفیت کچھ لمحے رہتی
تو ہمارے ذہنوں کی شریانیں پھٹ جاتیں
لیکن اس پل آکسٹرا خاموش ہوا
اور لتا کی رس ٹپکاتی، شہد آگیں آواز، کچھ ایسے ابھری
جیسے حبس زدہ کمرے میں
دریا کے رخ والی کھڑکی کھلنے لگی ہو
میں نے دیکھا
جسموں اور چہرے کے تناؤ پر
ان دیکھے ہاتھوں کی ٹھنڈک
پیار کی شبنم چھڑک رہی تھی
مسخ شدہ چہرے جیسے پھر سنور رہے تھے
میری نشنلسٹ کولیگز
ہاتھوں کے پیالوں میں اپنی ٹھوڑیاں رکھے
ساکت و جامد بیٹھی تھیں
گیت کا جادو بول رہا تھا!
میز کے نیچے
ریستوران کے مالک کی ہنس مکھ بیوی کے
نرم گلابی پاؤں بھی
گیت کی ہمراہی میں متحرک رہے تھے
مشترکہ دشمن کی بیٹی
مشترکہ محبوب کی صورت
اُجلے ریشم لہجوں کی باہیں پھیلائے
ہمیں سمیٹے
ناچ رہی تھی

پروین نے نظم ختم کی، ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ طالب علم لڑکیوں کے سیکڑوں چہرے چمک رہے تھے۔ پروین جس کتاب سے نظم پڑھ رہی تھی، اس نے وہ کتاب میری طرف یہ کہہ کر بڑھا دی۔ "جب آپ بمبئی جائیے گا تو میری طرف سے مشترکہ دشمن کی بیٹی کو یہ تحفہ دے دیجئے گا۔"

ہندوستان اور پاکستان میں لتا منگیشکر پر بہت سی نظمیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن پروین شاکر نے اس کو امن کی علامت بنا دیا ہے۔ ہند پاک دوستی کا سمبل۔

میں شاعروں کی محفل میں پروین شاکر کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ وہ شاعری کے مستقبل کے لئے ایک خوبصورت بشارت ہے۔

پروین شاکر کی شاعری سر تا سر جمال ہی جمال ہے نغمگی ہے، نغمگی ہے اور اس قسم کی شاعری ہمارے معاشرے کے لئے ضروری ہے۔ زندگی جیسی کہ ہماری دسترس میں ہے نہ اتنی جمیل ہے اور نہ ہی اتنی نازک، سوایسے میں پروین کی دھنک رنگ شاعری کا آنچل اگر لہرا رہا ہے تو اس دھنک کے لئے ہم اس خوش گو شاعرہ کے دل سے کیوں ممنون نہ ہوں اور حسن و محبت کے اس صحیفے کو جو پروین نے ہمیں سوغات میں دیا ہے کیوں نہ پلکوں پر رکھیں۔

اور اب ہم اس سے کہنا چاہتے ہیں۔ عزیز شاعرہ! تم غزل کی البیلی راجکماری طرف دیکھو کہ ہمارے اطراف میں کیا ہو رہا ہے اور تمہاری ذات کا دکھ سکھ ان اَن گنت رشتوں میں کس طرح جکڑا ہوا ہے اور آنکھیں کھولو اور غور کرو اس آواز کو سنو جو دنیا کے گوشے گوشے میں افریقہ میں 'لاطینی امریکہ میں گونج رہی ہے۔ یہ زندگی کا راگ ہے' اس کا کس بل دیکھو' یہ اس خرابی سے مکمل نفرت اور سناٹے میں فیصلہ کن دشمنی کا راگ ہے جو صدیوں کے ظالمانہ' روح کا گلا گھونٹ دینے والے نظام نے زبردستی ہمارے سروں پر تھوپ دیا ہے۔ آؤ کے واضح Cometment کا لمحہ آرہا ہے اور ہر سوچنے والے انسان کو پکار رہا ہے۔ یہ

بنگلہ دیشی اہل قلم کے ہمراہ

ہو۔ محنت اور فطری ذہانت سے زبان کو تم نے خوب خوب سنوارہ ہے اور اپنے موتی جیسے آبدار تخیل سے مصرعوں کے ہیرے تراشے ہیں۔ یہ کتاب ہاتھ میں لے کر ہم سوچتے ہیں کہ جو معاشرہ تم جیسی حسین دل والی لڑکیوں کی راہ میں کانٹے بچھاتا رہتا ہے کیا اس پھول جیسی سوغات کا مستحق بھی تھا؟ تمہاری شب بیداریوں نے تمہاری کتاب کے ہر صفحے پر جو نگینے جڑے ہیں ان کے عوض ہم تمہیں کیا دے سکتے ہیں یہ نظمیں اور غزلیں جو دل میں اترتی ہیں جیسے تھکی ہوئی پیشانی پر ٹھنڈی ہوا جاں بخش بوسہ دے اور ہمیشہ جگی رہنے والی نیند آنکھوں میں اتر آئے۔ ہماری داد' اس کے بے پناہ حسن کے سامنے کیا حیثیت رکھتی ہے؟ اور داد سے ان کا واسطہ بھی کیا۔ یہ شاعری تو تمہارے وجود سے اس طرح ابھری ہے جیسے کونپل آپ ہی آپ نمو کی قوت سے مجبور ہو کر پھوٹ نکلے۔

آنے والا لمحہ تم پر واضح کر دے گا کہ جہاں قاتل تلواریں لہرا رہی ہوں وہاں پھول نچھاور کر کے تم کچھ نہیں کر سکتیں اس تلوار کا جواب تمہیں شاعری کے کاری وار سے دینا ہوگا۔ آنکھوں سے یہ نیم خوابی کا فسوں نوچ کر پھینک دو اور چاروں جذبات ایک ہمعصر شاعری فطری تمنا تھے اسے یہ بتانا تھا کہ آواز میں آواز ملانے سے گونج کتنی دور تک جاتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ لکھنے کے لئے میں نے جب "خوشبو" کے اوراق کو پلٹا تو پہلے کی طرح یہ سب احساسات' حسن کے اس سیلاب میں بہہ کر نجانے کہاں سے کہاں نکل گئے۔ اور اس مسحور وار فتگی نے دوبارہ آلیا جہاں پر آپ حسن پر اعتراض نہیں کر سکتے کہ وہ خود پر اپنے ہونے کا سب سے جامع جواز ہے اور جس وقت دماغ یہ محسوس کر رہا تھا کہ آج کے دور میں جب زندگی کے سچ کے لئے اوروں کو گھمسان کے رن میں اترنا پڑے گا وہاں یہ بھی ٹھیک ہے کہ ان پیاسوں کو ٹھنڈے پانی کا گھونٹ پلانے والا بھی تو کوئی ہو۔ پروین کی شاعری کا سب سے بڑا جواز یہی ہے کہ اس کی لطافت اور نزاکت زندگی پر ایمان لانے کی تجدید کر کے ہمیں تازہ دم کر دیتی ہے۔

"خوشبو" ایک تاثر

فہمیدہ ریاض

صد برگ سے انتخاب

○

قدموں میں مرے تھکی ہُوئی رات
تاروں کی طرح بُجھی ہوئی رات

گِرتی ہے بدن پہ قطرہ قطرہ
خوشبُوئے کشید کی ہُوئی رات

آنکھوں پہ ستارے تن رہی ہے
آنگن میں مرے کِھلی ہُوئی رات

ماتھے پہ نئی رفاقتوں کے
افشاں کی طرح چُنی ہُوئی رات

خوابوں کی ہتھیلیوں پر
مہندی کی طرح رچی ہُوئی رات

آہٹ پہ کسی کی کسمسائی
دُلہن کی طرح سجی ہُوئی رات

تا عمر نہ ٹُوٹنے دے نشہ
ساقی سے مرے مِلی ہُوئی رات

چھُوتی ہوئی ایک ایک تارا
آکاش پہ تیرتی ہُوئی رات

حل ہونے لگی لہُو میں میرے
سانسوں میں ترے گھُلی ہُوئی رات

شبنم سے گلاب پُوچھتے ہیں
اب تک تھی کہاں چھُپی ہُوئی رات

اِک پل کو جھپک سکی نہ پلکیں
آنکھوں میں رہی رُکی ہُوئی رات

کیا چین کی نیند سو رہی ہے
اِک عمر سے جاگتی ہُوئی رات

ہے چُور تھکن سے لیکن اب تک
شاداب ہے ٹُوٹتی ہُوئی رات

اِک لمحہ سخن پہ ایسا آیا
چُپ ہو گئی بولتی ہُوئی رات

خاکم بدہن

سرکار!
ہم تو آپ کے ایماں نثار تھے
ہر مقتلِ جفا میں لہُو کے شریک تھے
کم پوشئ قبا میں رفُو کے شریک تھے
دل آپ دُکھا ہے تو آنسو اِدھر بہے
چوٹ آپ کو لگی تھی مگر نیل کب پڑے
اپنی ہی سمت کھنچا ہُوا تیر ہم بھی تھے
اپنے خلاف لی ہُوئی تعزیر ہم بھی تھے
لیکن یہ شکھ بہت تھا کہ کچھ معتبر تو ہیں
منزل نہیں ہیں آپ کی گردِ سفر تو ہیں
یہ کیا کیا کہ گردِ سفر بھی نہ اُٹھ سکے
چشمِ خطا سے بارِ نظر بھی نہ اُٹھ سکے
اب تک تو شہرِ جاں پہ عذاب آئے تھے مگر
اب کے تو اعتبار کی دُنیا اُجڑ گئی
ماتھے پہ بل نہ آنے دیا تھا کبھی تو پھر
لہجے میں اتنی گہری شکن کیسے پڑ گئی؟

بادباں کھلنے سے پہلے کا اشارہ دیکھنا
میں سمندر دیکھتی ہوں تم کنارہ دیکھنا

یوں بچھڑنا بھی بہت آساں نہ تھا اس سے مگر
جاتے جاتے اس کا وہ مڑ کر دوبارہ دیکھنا

کس شباہت کو لیے آیا ہے دروازے پہ چاند
اے شبِ ہجراں! ذرا اپنا ستارہ دیکھنا

کیا قیامت ہے کہ جن کے نام پر پسپا ہوئے
ان ہی لوگوں کو مقابل میں صف آرا دیکھنا

جب بنامِ دل گواہی سر کی مانگی جائے گی
خون میں ڈوبا ہوا پرچم ہمارا دیکھنا

جیتنے میں بھی جہاں جی کا زیاں پہلے سے ہے
ایسی بازی ہارنے میں کیا خسارہ دیکھنا

آئینے کی آنکھ ہی کچھ کم نہ تھی میرے لیے
جانے اب کیا کیا دکھائے گا تمہارا دیکھنا

ایک مشتِ خاک اور وہ بھی ہوا کی زد میں ہے
زندگی کی بے بسی کا استعارہ دیکھنا

پا بہ گل سب ہیں رہائی کی کرے تدبیر کون
دست بستہ شہر میں کھولے مری زنجیر کون

میرا سر حاضر ہے لیکن میرا منصف دیکھ لے
کر رہا ہے میری فردِ جرم کو تحریر کون

آج دروازوں پہ دستک جانی پہچانی سی ہے
آج میرے نام لاتا ہے مری تعزیر کون

کوئی مقتل کو گیا تھا مدتوں پہلے مگر
ہے درِ خیمہ پہ اب تک صورتِ تصویر کون

میری چادر تو چھنی تھی شام کی تنہائی میں
بے ردائی کو مری، پھر دے گیا تشہیر کون

سچ جہاں پابستہ، ملزم کے کٹہرے میں ملے
اُس عدالت میں سُنے گا عدل کی تفسیر کون

نیند جب خوابوں سے پیاری ہو تو ایسے عہد میں
خواب دیکھے کون اور خوابوں کو دے تعبیر کون

ریت ابھی پچھلے مکانوں کی نہ واپس آئی تھی
پھر لبِ ساحل گھروندا کر گیا تعمیر کون

سارے رشتے ہجرتوں میں ساتھ دیتے ہیں تو پھر
شہر سے جاتے ہوئے ہوتا ہے دامن گیر کون

دشمنوں کے ساتھ میرے دوست بھی آزاد ہیں
دیکھنا ہے کھینچتا ہے مجھ پہ پہلا تیر کون

جمالِ ہم نشیں

ترے آئینۂ فن میں
سراپا دیکھ کر اپنا
بہت حیران ہوں
اور بار ہا پلکیں جھپکتی ہوں کہ یہ میں ہوں
دکہ کوئی اور لڑکی ہے !۔
مری آنکھوں میں پہلے بھی شرارت تھی
مگر اب تو ستارے کھلکھلاتے ہیں !
مرے لب اس سے پہلے بھی تبسم آشنا تھے

لیکن اب تو بے ضرورت مُسکراتے ہیں
غرُور ایسا کہاں کا آگیا دھیمے مزاجوں میں
کہ دن میں بھی اُڑی پھرتی ہوں خوابوں کی ہواؤں میں
مرے لہجے میں ایسی نرم گامی کب سے در آئی
کہ جس سے بات کرتی ہوں
سماعت پھُول چُنتی ہے
ہنسی میں اس کھنک کی گُونج ہے
جس سے محبّت گیت بُنتی ہے
ور ان سب سے سوا
دل کی گدازی،

جو مجھ کم ظرف کو شائستۂ ضبطِ الم کر دے
کہ دشمن کی بھی اُنگلی تو میری آنکھ نم کر دے
سکھائے چشم پوشی
دوست کا پردہ رکھے

بلکہ
خلوصِ ہم رہاں کو شک کی آنکھوں سے ہمیشہ دیکھنا ہی
ترک کروا دے
لہُو کے اعترافِ عشق پر ایمان لانے کی بصیرت دے
مجھے گوتم کے ہر اُپدیش، عیسٰی کے ہر اک سرمن کا بین السطر
سمجھا دے !

میں اُس کی خوش گماں آنکھوں سے
دُنیا دیکھتی ہوں
مُسکرا کر سوچتی ہوں،
زمیں یک لخت کتنی خوبصورت ہو گئی ہے !

اِدرکنی

خیمۂ بے گناہی سے میں
شہرِ انصاف کی سمت جونہی بڑھی
اپنی اپنی کمیں گاہ سے
میرے قاتل بھی نکلے
کمانیں کسے، تیر جوڑے، طمنچے چڑھائے
مچانوں پہ ناوک بدستوں کو تیار رہنے کے احکام
دیتے ہُوئے

شاہراہوں میں پیاسی سنانیں لئے فتنہ گر صف بہ صف
چوک پر قاضیٔ شہر خنجر بکف
راستے دشنہ در آستیں
گھات میں شہر کا ہر مکیں
میرے تنہا کجاوے کی آہٹ کو سُنتے ہُوئے
عنکبوتی ہُنر میرے چاروں طرف جال بُنتے ہوئے
کوئی میرے علم کا طلبگار
کوئی میرے سَر کا خواہاں
تو کوئی ردا کا تمنائی بن کر
جھپٹنے کو ہے
حلقۂ دُشمناں تنگ ہونے کو ہے
موت سے آخری جنگ ہونے کو ہے
کُوفۂ عشق میں
میری بے چارگی
اپنے بالوں سے چہرہ چھپائے ہوئے
ہاتھ باندھے ہوئے
سر جھکائے ہُوئے
زیرِ لب ایک ہی اِسم پڑھتی ہُوئی
یا غفورُ الرّحیم!
یا غفورُ الرّحیم!

بدن تک موجِ خواب آنے کو ہے پھر
یہ بستی زیرِ آب آنے کو ہے پھر

ہری ہونے لگی ہے شاخِ گریہ
سرِ مژگاں گلاب آنے کو ہے پھر

اچانک ریت سونا بن گئی ہے
کہیں آگے سراب آنے کو ہے پھر

زمین انکار کے نشّے میں گم ہے
فلک سے اک عذاب آنے کو ہے پھر

بشارت دے کوئی تو آسماں سے
کہ اک تازہ کتاب آنے کو ہے پھر

دریچے میں نے بھی وا کر لیے ہیں
کہیں وہ ماہتاب آنے کو ہے پھر

جہاں حرفِ تعلق ہو اضافی
محبّت میں وہ باب آنے کو ہے پھر

گھروں پر جب یہ ہو گی سفیدی
کوئی عزّت مآب آنے کو ہے پھر

ـــــ تو برمن بلا شُدی

کچّے ذہن اور کچّی عُمر کی لڑکیاں
اپنی خوبی میں
ارتھ جیسی ہوتی ہیں
جس برتن میں ڈالی جائیں
اُسی شکل میں کیسے مزے سے ڈھل جاتی ہیں!
کیسا چھلکنا، کیسا اُبلنا اور کہاں کا اُڑنا!
اور اک میں ہوں ـــ پتھّر اور شوریدہ مزاج!
کاسۂ خالی میں بے وجہ سما جانے کی بجائے
اُس سے اس قوّت سے ٹکرانا چاہوں کہ
ظرفِ تہی کی گُونج سے اس کا بھرم کُھل جائے!
مَیں نے آئینے کو کب جھٹلایا ہے!
ہاں ـــ گہنے مجھ پر بھی اچھے لگتے ہیں
لیکن جب بھی مجھ کو ان کا مول کبھی یاد آتا ہے تو
کنگن بچھّو بن جاتے ہیں
اور پازیبیں ناگ کی صُورت میرے پاؤں جکڑ لیتی ہیں:
بہت ہی میٹھے بولوں کا جزوِ اعظم
جب حالتِ خام میں مجھ کو نظر آجاتا ہے
دہشت سے مری آنکھیں پھیلنے لگتی ہیں
اور اس خوف سے میری ریڑھ کی ہڈّی جمنے لگتی ہے کہ
ان ہی مادر زاد منافق لوگوں میں
مجھ کو ساری عُمر بسر کرنی ہے!

کبھی کبھی ایسا بھی ہُوا ہے
مَیں نے اپنا ہاتھ اچانک کسی اور کے ہاتھ میں پایا
لیکن جلد ہی میری ضرورت سے زاید بے رحم بصارت نے
یہ دیکھ لیا ہے
یا تو میرے ساتھی کی پرچھائیں نہیں بنتی ہے
یا پھر مٹّی پر
اُس کے پنجے اُس کی ایڑی سے پہلے بن جاتے ہیں
انسانوں کی سایہ رکھنے والی نسل ناپید ہُوئی جاتی ہے!
شام کے ڈھل جانے کے بعد
جب سایہ اور سایہ کناں دونوں بے معنی ہو جاتے ہیں
مَیں مکروہ ارادوں والی آنکھوں میں گھِر جاتی ہُوں
اور اپنی چادر پر تازہ دھبّے بنتے دیکھتی ہُوں
کیونکہ مجھ کو ایک ہزار راتوں تک چلنے والی کہانی کہنا
نہیں آتی
مَیں ـــ آقائے ولی نعمت کو
خود اپنی مرضی بھی بتانا چاہتی ہُوں!

ظلِّ الٰہی کے پرابلمز

راج پاٹ کرنے والوں کی جان
ہتھیلی پر رہتی ہے
بے چاروں کے مسائل کیسے عجب ہوتے ہیں
کبھی اس باجگزار ریاست کی شوریدہ سری
کبھی اُس زیرِنگیں صُوبے کی نافرمانی
کبھی خود پایۂ تخت کے اندر غیر مناسب بیداری
کبھی سپہ سالارِ اعظم کا شوقِ لشکر آرائی
کبھی امیرِ مطبخ کی خاصے میں خاصی غیر ضروری دلچسپی

شہزادوں کی شورہ پشتی
حرم سرا میں پلنے والی چھوٹی بڑی سیاست
بالاعلان بغاوت • در پردہ سازش!

دُشمن جلد ہی کُھل جاتے ہیں
ان سے نبٹنا اتنا مشکل کام نہیں
اُلجھاوا تو پاؤں چُومنے والوں سے پڑتا ہے!
اور ان کی بھی دو قسمیں ہیں
ایک تو کُتّے ——

اپنی وفاداری میں شہرۂ عالم رکھنے والے
جب تک جی چاہے پیروں میں لوٹتے ہیں
پھر اپنی اپنی ہڈّی لے کر الگ ہو جاتے ہیں
دوسری قسم زیادہ مہلک ہے
یہ دو پیروں پر چلتی ہے
دیکھنے میں انسان مگر باطن کے ریچھ
تلوے چاٹتے چاٹتے اپنے پیارے آقا کو ایسا کر دیتے ہیں کہ

ایک سُہانی صُبح کو جب
اپنی کنیزِ خاص کی بھیرویں سُن کر آنکھیں کھولتے ہیں تو
ظلِّ الٰہی
اپنے پاؤں ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں!

پروین شاکر کی شاعری

ڈاکٹر آفتاب احمد

برسوں ہوئے گئی رات کے کسی ٹھہرے ہوئے سناٹے میں ایک کچی عمر کی لڑکی نے اپنے رب سے دعا مانگی کہ وہ اس پر اسکے اندر کی لڑکی کو منکشف کردے۔ دعا قبول ہوئی اور اس لڑکی کو چاند کی تمنا کرنے کی عمر میں ذات کے شہر ہزار در کا اسم عطا کر دیا گیا۔ پھر جب موسم آیا تو شہر ذات کی گلیوں میں زندگی نے خوشبو کھیلی اور بہار نے آنکھوں پر پھول باندھ دیئے۔ انہی پھولوں کی پنکھڑیاں چنتے چنتے آئینہ در آئینہ خود کو کھوجتی یہ لڑکی شہر کی اس سنسان گلی تک آ پہنچی یہاں اس نے مڑ کر دیکھا تو دور دور تک کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔ اس لڑکی نے اپنے عکس کو جوڑنے کی سعی کی لیکن اسی کو اعتراف ہے کہ اس کھیل میں کبھی تصویر دھندلا گئی اور کبھی انگلیاں لہولہان ہو گئیں۔ یہ جو کچھ آپ ابھی سن رہے تھے اس میں میری طرف سے کچھ نہیں کہا گیا۔ یہ اس داستان کے منتخب جملے ہیں جو اس لڑکی نے اپنے پہلے مجموعہ کلام "خوشبو" کے پیش لفظ "دریچہ گل" سے جھانکتے ہوئے اپنے بارے میں ہمیشہ سنائی ہے۔ یہ لڑکی وشاعرہ امروز ہے جسکے احترام کیلئے ہم آج یہاں جمع ہوئے ہیں۔ پروین شاکر نے اپنی شاعری کے سفر کا آغاز "خوشبو" کے وطن یعنی خوش رنگ پھولوں، خوش نما رنگوں اور خوش نوا طائروں کی وادی سے کیا مگر جلد ہی زندگی نے انکی راہ میں کانٹوں کے جال بچھا دیئے۔ چونکہ وہ طبعاً گلشن پرست واقع ہوئی ہیں لہٰذا انہوں نے پھول ہی نہیں چنے "کانٹے ابھرتی ڈوبتی نظر آتی ہیں" تخلیق کی دیوی ان کے ہاں یہ چہرہ تبسم بہ چشم تر آئی ہے

ذات کے شہر ہزار در میں سے پروین شاکر نے جو در پار کئے ہیں ان میں عشق و محبت در کا ذکر خاص توجہ کے قابل ہے۔ بات یہ ہے کہ عشقیہ شاعری بیشتر مرد شاعروں نے کی ہے اور اس میں مردوں ہی کے دل کی بپتا اور انہی کی رام کہانی بیان ہوئی ہے۔ ہندی شاعری میں عورت عاشق ضرور ہے مگر شاعری کے خالق وہاں بھی اکثر مرد ہی اپنے ہیں۔ لہٰذا عشقیہ شاعری مردوں کی چیز بن کر رہ گئی ہے اردو کی حد تک تو یہ بات حتمی طور کی جا سکتی ہے۔ اگلے وقتوں کے ایک اردو شاعر نے تو عشق کی بات کے بارے میں عورتوں کی زبانی یہ تک کہا تھا کہ

ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

خود میرے لڑکپن کے زمانے میں پردہ داری کا یہ عالم تھا کہ رسالوں میں خواتین کی سیدھی سادی، نہایت بے ضرر قسم کی نظموں، غزلوں اور افسانوں کے ساتھ ان کے پورے نام شائع نہیں کئے جاتے تھے بلکہ صرف ناموں کے حروف اول ایک شاعرہ ز خ ش صاحبہ تھیں۔ نہ جانے ان کا نام کیا تھا۔ شاید کسی گڑھ کے شروانی خاندان سے تھیں۔ پھر ایک ح ب صاحبہ تھیں وہ چونکہ رشتے میں میری پھوپھی تھی لہٰذا مجھے معلوم ہے کہ ان کا نام حمیدہ بیگم تھا اور ان کی چھوٹی بہن زب یعنی زہرہ بیگم افسانے لکھتی تھیں۔ اب تو ماشاء اللہ اہل قلم خواتین کی ہمارے دور میں خواتین اہل قلم نے کوئی قدغن قبول نہیں کی اور سب بندھن توڑ دیئے ہیں۔ شروعات اسکی عصمت وچغتائی سے ہوئی۔ ان سے لے کر پروین شاکر تک جائیے۔ انسانی زندگی کا وہ کون سا پہلو اور انسانی نفسیات کا وہ کون سا گوشہ ہے جسکی تصویر کشی اور کسی دسترس سے باہر رہی ہے۔ آج شام گفتگو چونکہ پروین شاکر جیسے لہٰذا ان کے بارے میں عرض کروں گا کہ انہوں نے عشق و محبت کی بات کسی قسم کے تکلف اور جھجک کے بغیر کی ہے اور عورت کی حیثیت سے کی ہے۔ اس صنف میں اس دور کی شاعرات میں اول آخر کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا ممکن ہے کل کوئی محقق میری بات کو غلط ثابت کر دے مگر یہ ضرور کہوں گا کہ پروین شاکر نے بڑی سچی، کھری اور لفظ و بیان کی خوبیوں سے سجی ہوئی عشقیہ شاعری کی ہے۔ اسکے تیور تو یہی بتاتے ہیں کہ اس کا محرک تجربہ ان کے ہاں نہ محض زبانی جمع خرچ کی بات ہے اور نہ کوئی ایسا خیالی موضوع جو برائے شعر گفتن خوب است کی ذیل میں آتا ہو۔ انہوں نے اس تجربے کو اپنے رگ و پے میں محسوس کیا ہے اور اسکی مختلف حسیاتی اور نفسیاتی کیفیتوں کو کبھی کھلے صاف لفظوں پر بیان کیا ہے اور کبھی استعارے میں لا کر عام کو خاص بنا دیا ہے۔

اپنے مجموعہ کلام "خوشبو" کے پیش لفظ میں پروین شاکر نے کہا تھا کہ وہ تخلیق کے تمام لمحوں میں صرف اپنے وجدان کے سامنے جواب دہ رہی ہیں۔ انہوں نے واقعی اس دعویٰ پر عمل بھی کیا ہے اور وہ سب کچھ ہمارے سامنے رکھ دیا ہے جس پر انکی وجدان کی مہر ثبت تھی۔ اس میں وہ حسیات بھی شامل ہیں۔ وصل و اختلاط کے لمحوں کا حصہ ہیں اور جنہیں پروین شاکر نے بڑے سلیقے اور ہنرمندی سے لفظوں میں اسیر کیا ہے۔

خوشبو ہے وہ چھو کے بدن کو گزر نہ جائے
خود پھول نے بھی ہونٹ کئے اپنے نیم وا
چوری تمام رات کی تتلی کے سر نہ جائے
ایسا نہ ہو لمس بدن کی سزا ملے
جی پھول کا ہوا کی محبت سے بھر نہ جائے

آپ نے دیکھا کہ لمس بدن کی لذت کا ذکر پھول اور تتلی یا پھول اور ہوا کے حوالے سے ہوا ہے۔ مضمون کے لیے یہ پروین شاکر کا محبوب استعارہ ہے اور بار بار ان کے کلام پر آتا ہے۔ البتہ اپنی ایک تازہ غزل کے ایک شعر میں انہوں نے اسے ایک نیا روپ دے دیا ہے۔

اک حجاب تہہ اقرار ہے مانع ورنہ
گل کو معلوم ہے کیا دست صبا چاہتا ہے

اردو شاعری میں محبوب کیلئے گل کا استعارہ تو بہت عام ہے۔ پروین شاکر کے شعر میں بھی گل وہی گل ہے اور دست صبا کی ترکیب بھی نئی نہیں۔ اپنے لغوی معنوں میں حافظ سے اقبال اور فیض تک مسلسل چلی آتی ہے۔ یہاں پروین نے اس میں ایک نئی اور گہری معنویت اس طرح پیدا کی ہے کہ گل، دست صبا یعنی اپنے چاہنے والے کی خواہش سے واقف ہے اور سپردگی پر مائل بھی مگر اپنے اندر کے حجاب کے ہاتھوں مجبور ہے۔ غور کیجئے تو اس شعر میں گویا گل اور دست صبا کے ازلی ابدی رشتے یعنی اس گتھی کی نفسیاتی حقیقتوں کی نقاب کشائی کی گئی ہے جو کبھی آدم اور حوا کے ہاتھوں الجھی تھی۔

مدتوں بعد اس نے آج مجھ سے کوئی گلہ کیا
منصب دلبری پہ کیا مجھ کو بحال کر دیا

منصب دلبری سے آپ کو غالب کا منصب شیفتگی یاد آئیگا مگر یہ نسبت بس یہیں تک محدود ہے۔ پروین شاکر نے منصب دلبری پر اپنی بحالی کے بارے میں جس انوکھے انداز سے سوچا ہے اور جس طرح محبوب کے مدتوں بعد گلہ کرنے کو اسکا جواز ٹھہرایا ہے وہ ایک خاص قسم کی نسائی عمومیت کا مظہر بھی ہے اور اسی آدم و حوا کی الجھائی ہوئی گتھی کا ایک تار بھی۔

آدم و حوا کے قصے کا حوالہ ایک چھوٹی سی نظم "وصال" میں براہ راست بھی موجود ہے۔

مختصر یہ کہ عشق و محبت کے باب میں اس قسم کی نرم و نازک کیفیتوں کا بیان ملائم اور حساس لب و لہجے میں پروین شاکر کی بہت سی غزلوں اور نظموں میں آپ کو ملے گا اردو کی عشقیہ شاعری میں یہ ایک ایسا دل پسند اور خوش آئند اضافہ ہے جو صرف ایک شاعرہ ہی سے ممکن تھا شعراء حضرات اپنی کتھا صدیوں سے سنا رہے ہیں اور بہت کچھ سنا چکے ہیں۔

شاعر یا شاعرہ چاہے شعر کہنے کی ایک قیمت اسے بہر حال ادا کرنی پڑتی ہے۔ غالب جیسی جید اور مضبوط شخصیت کے شاعر کو بھی کسی قدر تاسف کے ساتھ کہنا پڑا تھا۔

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

پروین شاکر کے شعروں میں صرف ان کے دل کا معاملہ ہی نہیں کھلا ان کی ذاتی زندگی کے حوالے کے کئی دوسرے معاملات اور واقعات بھی سامنے آئے ہیں بلکہ یوں کہئے کہ وہ خود انہیں سامنے لائی ہیں۔ اس لیے کہ انہوں نے براہ راست ان کو موضوع سخن بنایا ہے اس کی ایک وجہ شاید الجھنوں میں گرفتار ہو گی وہ شاعری میں بھی راہ پا جائیں گی۔ بہر حال یہ الگ بحث ہے ۔۔۔ مگر یہ سمجھنا بھی غلط ہو گا کہ پروین شاکر شہر ذات میں محصور ہو کر رہ گئی ہیں۔ باہر کی دنیا بھی ان کی شاعری میں جیتی جاگتی نظر آتی ہے۔ غزلوں کو چھوڑیئے کہ ان کے اشعار میں رمز و ایما اور اشاروں کنایوں کی زبان استعمال ہوتی ہے ان کی نظموں کے عنوانات ہی ایک نظر ڈالنے ہی سے اسکا اندازہ ہو جائیگا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کو دنیا کی اچھی چیزیں ذرا زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ اور کیوں نہ لگیں یہ ان کا حق ہے۔ انہوں نے زندگی سے اپنی شدید محبت کا پورے غرور کے ساتھ اعتراف کیا ہے اس کے باوجود بعض ناگوار حقیقتوں کا شعور بھی پروین شاکر کے ہاں موجود ہے اور اس شعور کے اظہار کیلئے طنزیہ لب و لہجہ بھی طنز و مزاح کی بہترین مثال تو پروین شاکر کی وہ طویل نظم شہزادی کا المیہ ہے جس میں شہزادی کو اب کے اپنے حواریوں نے پریشان کر رکھا ہے۔ یہ نظم واقعی اپنی طرز کی واحد نظم ہے بڑے مزے کی چیز ہے اور بڑی دلچسپ حقیقتوں کی علمبردار بھی اس نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہر ذات ہی نہیں ایوان اقتدار کے حالات و کوائف بھی پروین شاکر کی نظر میں ہیں اور وہ ان کو بیان کرنیکی قدرت بھی رکھتی ہیں۔ پروین شاکر کی شاعری کی ایک پہچان ان کی زبان کی سادگی و پرکاری بھی ہے ان کے ہاں الفاظ و تراکیب کے انتخاب اور استعمال میں ایک خاص رکھ رکھاؤ اور احساس حسن پایا جاتا ہے..... عام طور پر ان کی شاعری دھیمے لہجے، میٹھے بول کی شاعری ہے مگر جب بول ہی کڑوے ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ لہجہ بھی دھیما نہیں رہتا۔ اس کی کئی ایک مثالیں بھی ان کے کلام میں ملتی ہیں۔ خصوصاً وہاں جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے بعض ناگوار تجربات اور محبوب سے خفگی کا اظہار کیا ہے۔

پروین شاکر کی شخصیت میں جو خود اعتمادی پائی جاتی ہے اور جس کی جھلکیاں ان کی شاعری میں بھی موجود ہیں اس کے سہارے انہوں نے زندگی میں مشکلات کا مقابلہ کیا ہے سر ہمیشہ اونچا رکھا ہے اور گیت بننے اور خوشبو پھیلانے میں کبھی کوئی کمی نہیں آنے دی سترہ اٹھارہ برس کی مدت میں ان کے چار مجموعوں کی اشاعت اس کا بین ثبوت ہے۔

"چالاک شہزادی"

خالدہ حسین

پروین شاکر سے شناسائی کا دعویٰ محض اسی قدر ہے کہ وہ پروین شاکر ہے۔ پروین اس طرح کہ محفلیں اس کے دم سے بجتی ہیں۔ شاکر ہونے کا حال اس کے کلام سے کھلتا ہے زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور خوشگوار کیفیتیں جنہیں فطرت بے دام و درہم لٹاتی ہے اور اپنے غرور و تکبر میں ہم ان کی طرف نگہ اٹھا کر دیکھنا تک گوارا نہیں کرتے۔ وہ سب کی سب پروین کے لئے نعمت کا درجہ رکھتی ہیں۔ ہوا، خوشبو، پرندے، رنگ، پھول، لے، لمس، ذائقہ اور پھر وہ لامحدود کائنات جو اپنے تمام تر عجائبات کے ساتھ ہر جی کے لئے دستر خوان کی طرح بچھادی گئی۔

مگر یہ تو انتہائی رجعت پسندانہ بات ہوئی۔ ترقی پسندی کا تقاضا ہے کہ شعر کہنے والی عورت کو جھانسی کی رانی بنادو، نہیں تو دوسری انتہا پر فٹ میٹ کا درجہ تفویض

نسی سوہا کے ساتھ

کرو۔ ورنہ شاعری میں Sensatinabsim کہاں لے آئے گا۔ مگر میں انتہائی لاعلاج قسم کی داستان پرست ہوں۔ مجھے اذنِ گفتگو دے کر پروین نے اپنی ترقی پسندی کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ سبزہ بیگانہ رازِ چمن، بیرونِ چمن لے جانے سے نہیں چوکتا۔ تو حاضرین باتمکین بات محض اسی قدر ہے کہ پروین مجھے داستان گو شاعرہ محسوس ہوتی ہے۔ داستان گوئی اور حکایات نگاری کا یہ طلسم ن م راشد، ابن انشاء، مجید امجد سے ہوتا ہوا ہمارے وقتوں میں منیر نیازی کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنے عہد کا استعارہ بن گیا۔

بچپن اور کچی عمر اور نوجوانی میں کہانیاں ہر کوئی سنتا ہے ہمارے بڑے بوڑھے، اتنی احتیاط ضرور برتتے تھے کہ دن میں کہانیاں نہیں سناتے تھے۔ کہ مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ مگر کچھ کو ایسا من رس بھی ہوتا ہے کہ اپنی ہٹ دھری سے دوسروں کو کھڑی دوپہروں میں کہانیاں سنانے پر مجبور کردیتے ہیں۔ لگتا ہے پروین شاکر نے ہمیشہ دن ہی میں کہانیاں سنیں اور راستہ بھول گئی۔ اب یہ مقدر کی بات ہے کہ راہ گم کردہ ہی راہ راست پر نکلیں خود ہی رستہ خود ہی مسافر! پہلے یہ لڑکی حسن خوابیدہ اور شہر فتنہ کے سحر میں گرفتار ہوئی۔ چوڑیوں، چنریوں، افشاں، رنگوں اور پھولوں کی باتیں کرتے کرتے چرخے کا تکلا انگلی میں ایسا چبھا کہ ہونی کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ اب یہ تو ہماری شاعرہ کو بہت دیر میں خبر ہوئی کہ یہ عہد گم جو شہزادوں سے خالی ہے، جو ہرج مرج کھینچتے کسی کوہ ندا کی خبر لینے، سات سوالوں کا جواب پانے یا سوئے شہر کی شہزادی کو جگانے جان جوکھوں میں ڈالتے ہیں۔ خیر یہ تو اس نے پہلے دن ہی تسلیم کرلیا تھا کہ بچے ہمارے عہد کے چالاک ہوگئے۔ لہٰذا یہ چالاک شہزادی بھی اپنی طلسماتی نیند سے خود بخود بیدار ہوئی۔ یہ خود کفالت کا دور ہے، اور کچھ نہیں تو بندہ اپنے خوابوں میں ضرور خود کفیل ہو۔ آنکھیں ملتے ہوئے اس نے گرد اگرد دیکھا۔ اس کے وقت کی ایک بہت بڑی رو پہلی قاش ماضی کے سمندر میں غرق ہونے کو ہے۔

کھول دیں زنجیرِ در اور حوض کو خالی کریں
زندگی کے باغ میں اب سہ پہر ہونے کو ہے

ہر منظر بدل رہا ہے۔ موسم ہجر کی آمد آمد ہے۔ چیزوں کے معنی بدلنے لگے ہیں۔ چاند کی کرنوں کی سیڑھی اب اس کی منڈیر سے کچھ دور ختم ہو جاتی ہے۔ اس نے سوچا کہ خواب دیکھنا بند کر دے مگر خواب دیکھنا بھی کچھ اپنے اختیار کی بات ہے؟ رومان پرستی کا جادو سر چڑھ کے بولتا ہے اگچہ وہ اپنے دور کی سنڈریلا نہیں یہ شہر قصہ کی شہزادی سے زیادہ پختہ و چالاک تھی کہ سنڈریلا ایک جابر معاشرے کے ناانصاف شب و روز میں سے چند لمحے الوہی محبت اور کیف و سرور کے چرا کے زندگی کے عظیم رقص میں شامل ہوتی ہے۔ مگر جب آدھی رات ادھر آدھی ادھر ہوتی ہے۔ بارہ کا گھنٹہ بجنے کو ہے۔ اسے مجبوراً شہزادے کی دلنواز اداؤں اور عنایات کو چھوڑ کر اس جلیل و جمیل رقص گاہ سے اپنی ٹوٹی پھوٹی دنیا میں واپس آنا ہے۔ بھاگ دوڑ میں ایک پاؤں سے شیشے کی جوتی پیچھے محل میں رہ گئی ہے۔ مگر اسے یہ خدشہ کھائے جاتا ہے کہ بارہ کے آخری گھنٹہ پر اسکی زرنگار بگھی پھر سے کدو اور کڑیل تھرتھراتے ساتوں گھوڑے چوہوں میں بدلنے کو ہیں۔ اپنے شاہانہ لباس تلے اسے چیتھڑے جھانکتے نظر آنے لگے ہیں۔ اس بہروپ کی ماری اپنے بھرم کی خاطر وہ پتھریلی گلیوں اور خاردار صحراؤں اور بگولے اڑاتے ویرانوں میں برہنہ پا بھاگتی چلی جاتی ہے۔ ان اونچی نیچی متعفن گلیوں میں ایک طرف بشیرے کے گھر والی کولہو میں جتی ہے تو دوسری طرف ٹھیٹھو کیچ اپ عورت دھری ہے۔ تختہ کمر اور دھندلی آنکھوں والا کلرک کرم خوردہ فائلوں کے ڈھیر پر کھڑا زنگ آلود کھڑکی سے باہر جھانکتا ہے تو دوسری جانب یخ بستہ، ساؤنڈ پروف کمرے میں بے چہرہ افسر کوئی انجانی ابجد بول رہا ہے۔ اب اس پر کھل چکا ہے کہ وہ ایک شجاعت سے عاری معاشرے میں سانس لینے پر مجبور ہے۔ اب شہزادے گم شدہ شہزادی کی جوتی لیکر اس کی تلاش میں گلی گلی صدائیں لگاتے۔ انہیں اتنی فرصت نہیں۔ ان کی توجہ اور ذہنی ارتکاز کا دورانیہ انتہائی قلیل ہے۔ اس لئے وہ اپنے حافظے کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔ حافظہ جو اشرف المخلوقات کی فضیلت ہے۔ پس انہیں کسی بھی غائب شے کی تمنا میں جان کھپانے کی رسم یاد نہیں۔ وہ محض حاضر، موجود اور محسوس کی دنیا میں رہتے ہیں۔ یہی ان کا شاید و مشہود ہے۔ سامری نے سونے کا بچھڑا بیچ چوراہے لا کھڑا کیا ہے۔ اہل شہر اور افسران ذی چشم اور فیضان عالی مرتبت اسکے طواف میں سرگرداں ہیں۔

جب آدمی کا ضمیر زوال پذیر ہوتا ہے تو شجاعت اور ظلم کے معنی ایک ہو جاتے ہیں۔ انصاف اور تعصب ہم جنس قرار پاتے ہیں۔ یہ برہنہ پا سنڈریلا زندگی کا ہفت خواں لے کر کے شہر حقیقت کے دروازے پر متذبذب کھڑی ہے۔ پیچھے سے آوازیں پکارتی ہیں مگر وہ پیچھے مڑ کے دیکھنے والوں کے انجام سے باخبر ہے۔ وہ ایک نیا شہر سنگ آباد کرنا نہیں چاہتی۔ اب وہ ان لوگوں میں شامل ہونے کا پورا شعور رکھتی ہے۔ جنہیں حسن سے بھی لگاؤ ہے، جنہیں زندگی بھی عزیز ہے۔ قدرت کا سارا نظام اسی اصول کی طرف انسان کی رہبری کرتا ہے کہ تاب لاتے ہی بنے گی اور واقعہ سخت ہے اور جان عزیز۔ کارزار ہستی میں جو کبھی لڑتا ہر فرد کا مقدر ہے۔ ہر ایک کے پاس اپنی اپنی ڈھال اپنی اپنی تلوار ہے۔ پروین کا انداز مدافعت ہے مخاصمت نہیں۔ اس نے پیش قدمی اور پسپائی کے درمیان مورچہ لگایا ہے۔ وہ نہ تو باغی عورت ہے نہ ہی دلگیری و مسکینی اس کا شعار۔ چاند بی بی نہ میرا بائی۔ اس نے گرم و سرد زمانہ سہنے کا جو Insolation بالآخر منتخب کیا ہے وہ عورت کی تکمیلی صورت ہے۔ وہ ماں ہے سراپا محبت اور دعا۔ اس محبت نے ریگستان اور غول بیابانی میں بادل کا وہ چھوٹا سا مہربان ٹکڑا جو راج دلارے کے سر پر سایہ کئے ساتھ ساتھ چلتا، اسے باد سموم سے بچاتا ہے۔ تپتی ہوا نہیں لگنے دیتا۔ ہر ایک ماں کا حرف دعا ہے جو کبھی اپنے بچے کبھی اپنی سرزمین اور کبھی پوری انسانیت کے لئے بشارت بن کر آتا ہے۔

پروین شاکر کی انفرادیت یہی ہے کہ جاگتی۔ بے چین زہر آلود اور مردم گزیدہ راتوں میں بھی وہ خواب دیکھنے کو ایک آدھ لمحہ چرا لیتی ہے۔

مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو میری رہی

شاید اپنے دور کے صحافتی اور نظریہ ساز رجحان سے متاثر ہو کر اس نے بھی صحافتی سیاسی اور جسمانی شاعری کی ہے یہ جرات آموز میری تاب سخن سے مجھ کو کا مصداق ہیں مگر جب بھی ذرا سانس لینے کو رکتی ہے فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی۔ بادل۔ بارش۔ روشندانوں میں گھر بنانے والی چڑیاں اور ساون بھادوں اور جیٹھ اساڑھ کے زمینی رنگ اور سیاروں اور چاند تاروں کی دنیا اسے اس بستی سے دور لے جاتی ہے۔ جو اپنی بے بضاعتی میں بقدر تنگی چشم حسود ہے۔ اپنے گھر کی خستہ ٹپکنے والی چھت اور چھلنی دیواروں کی قدر و عافیت کا احساس اس کے خمیر میں شامل ہے۔ وہ سوچتی بھی ہے تو خود اپنے ملبے پر بیٹھ کر۔ انسان کے اندر چھپے بھیڑیے اس پر عیاں ہو چکے ہیں۔ اور وہ بے گھری، اور بے زمینی کے عذاب سے واقف ہے۔ اپنے سمندر اپنے دریا اور اپنی مٹی مل کر اس کی وہ تصویر بناتے ہیں جو ہر جبر منافقت اور شکست پسندی کے سامنے حرف انکار کی ڈھال بن جاتی ہے۔

بس خدشہ ہے تو یہ کہ اپنے عہد کی یہ برہنہ پا سنڈریلا ہنگامی شعر گوئی اور مشاعروں کی داد و تحسین کی اسیر ہو کر نہ رہ جائے۔ کہ اس میدان میں بڑے بڑے بھرتی کے اشعار کا شکار ہو جاتے ہیں۔ خالی لفظوں کے انبار پہ انبار لگ جاتے ہیں جو ذرا سی ٹھوکر پر یوں کھنکھناتے ہیں کہ سننے والا بہرہ ہونے میں ہی عافیت محسوس کرتا ہے۔ لفظ محض آواز نہیں۔ لفظ ایک متاع ہے جو کاغذ پر اتر کر قدر و قیمت پاتا ہے۔ اور سینوں میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ بولنے والے کی ہستی سے الگ اس کی ذات کے طلسم اور شادابی سے ورے۔ تیز جھکڑوں اور تند آندھیوں میں سلامت رہ کر توقیر پاتا ہے یہی اس کا اصل منصب ہے۔

ایک متاثر کن مجموعہ کلام

تحریر: انور عنایت اللہ

پروین شاکر کے پہلے مجموعہ کلام خوشبو میں ایک شعر ہے ۔

کانپ اٹھتی ہوں میں یہ سوچ کے تنہائی میں
میرے چہرے پہ تیرا نام نہ پڑھ لے کوئی

پروین کے دوسرے مجموعہ کلام "صد برگ" میں جو کہ پہلے مجموعے کے تین سال بعد شائع ہوا۔ ایک چیز جو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے یہ ہے کہ زندگی کے بارے میں ان کا رویہ انتہائی جذباتی ہے۔ یہ مجموعہ بھی "خوشبو" کی طرح اردو شاعری کا کلاسیکل رنگ لئے ہوئے ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

وہ تو جاں لے کے بھی ویسا ہی سبک نام رہا
عشق کے باب میں سب جرم ہمارے نکلے

کسی حد تک یہی رویہ "خود کلامی" میں بھی پایا جاتا ہے جو پروین شاکر کا تیسرا مجموعہ کلام ہے جس میں نوے (90) غزلیں اور نظمیں شامل ہیں مگر اب ایک فرق واضح ہے۔ ۔

شام کی نا سمجھ ہوا پوچھ رہی ہے اک پتہ
موجِ ہوائے کوئے یار کچھ تو مرا خیال بھی

ایک جگہ فرماتی ہیں ۔

کیا ایسی تلاشِ آب و دانہ
پرواز کا لطف بھول جائیں

تقریباً سات سال پہلے جب "خوشبو" دنیائے ادب کے افق پر نمودار ہوئی تو شاعرہ کی عمر کوئی بائیس تیئس سال ہوگی۔ یہ عمر کا وہ دور ہے جب چاہے جانے اور چاہنے کی شدید خواہش دوسری تمام حقیقتوں پر حاوی ہوتی ہے زندگی کی تلخ حقیقتوں پر بھی۔ اس عمر میں زیادہ تر شعراء کے ہاں دبی ہوئی خواہشات ان کے کلام میں جابجا اپنا سر نکالتی نظر آتی ہیں مگر پروین شاکر کے ہاں یہ عام رویہ ان کی ادبی زندگی میں وقت سے پہلے ہی تبدیل ہونا شروع ہو گیا یہی وجہ ہے کہ ان کی بعد کی شاعری سطحی انسانی جذبات سے ماوراء ہے۔ "صد برگ" میں کہتی ہیں ۔

سچ جہاں پابستہ ملزم کے کٹہرے میں ملے
اس عدالت میں سنائے گا عدل کی تفسیر کون

"خود کلامی" میں یہ واضح ہے کہ شاعرہ نے جو سفر "خوشبو" سے شروع کیا تھا وہ اب اس راہ پر بہت آگے نکل آئی ہیں۔ اب ان کی شاعری کی راہیں اور ان کی ذہنی اپچ ایک نوجوان جذباتی سی لڑکی کو پیچھے چھوڑ آئی ہیں اور اس کی جگہ ایک بالغ اور حساس ذہن نے لے لی ہے۔ گو ابھی بھی رومانی سوچ میں تبدیلی نہیں آئی ہے مگر اب پروین اپنے چہار طرف چھائی ہوئی اذیتوں اور اداسیوں کو محسوس کرتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی ان کی شاعری میں موسیقی کی چھنک اور تال ابھرتی نظر آتی ہے۔

اب یہ ظاہر ہے کہ شاعرہ کی نگاہیں افق کے پار دیکھنے کی خوبی اپنا چکی ہیں۔ ہمارے وقت کی اذیتیں اور ایک نسل کے مصائب جو ہیروشیما میں ایٹم بم پھٹنے کے بعد انسانوں کا مقدر بنیں اور اپنے دامن میں ان گنت تباہیاں سمیٹ لائیں پروین شاکر کی نظموں "مس فٹ" "اختیار کی ایک کوشش" اور "نئے سال کی پہلی نظم" سے صاف جھانک رہی ہیں۔ اب ان کے جذبات پیچھے چلے گئے ہیں اور ان میں چھپا دانشور اور فلاسفر اگلی صفوں میں آ گیا ہے۔ حقیقت کو نیا روپ دینے کی شدید خواہش "خود کلامی" کے 190 صفحات کے ہر صفحہ پر اپنا نقش ثبت کئے ہوئے ہے۔ وہ اشعار بھی جن میں وصل، جدائی، تنہائی اور قنوطیت کے رنگ ہیں شاعرہ کی مضبوط گرفت میں ہیں۔

پروین شاکر کے اشعار صاف شفاف اور سادہ اسلوب لئے ہوئے ہیں۔ ان کی چھوٹی بحروں میں کہے گئے اشعار میر اور ناصر کاظمی سے کلاسیکل شعراء کا رنگ لئے ہوئے ہیں۔ گو وہ غزل اور نظم دونوں ہی اصناف شاعری میں یکساں طور سے متاثر کرتی ہیں ذاتی طور پر میں ان کے اشعار کی موسیقیت سے متاثر ہوں۔ پروین شاکر کی شاعری کے اسی مضبوط پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے ای۔ ایم۔ آئی (پاکستان) نے "خود کلامی" ہی کے عنوان سے ایک خوبصورت انداز میں ریکارڈ شدہ کیسٹ جاری کیا ہے جس کی ابتداء خود پروین شاکر کی خوبصورت آواز سے ہوتی ہے اس

مترجم:
ڈاکٹر احسان احمد شیخ

کے بعد غلام علی، ممتاز، عابدہ پروین، ممتاز شیرازی اور حبیب ولی محمد کی گائی ہوئی غزلیں کیسٹ کی ایک طرف ہیں۔ دوسری طرف رونا لیلیٰ، طاہرہ سید، بینا یاسمین، مسرت نذیر اور سب سے بڑھ کر مہدی حسن ہیں جنہوں نے راگ درباری میں پروین کا کلام گا کر حق ادا کر دیا ہے۔ کچھ دھنیں نثار بزمی نے بنائی ہیں۔ جبکہ پروین شاکر کی آواز کے پس پردہ ستار پر الاپ ایک سماں باندھ دیتا ہے۔ گو تمام ہی گانے والوں نے بہترین گلوکاری کا مظاہرہ کیا ہے مہدی حسن، عابدہ پروین اور ممتاز شیرازی اس کیسٹ میں اپنے فن کی بلندیوں کو چھو رہے ہیں۔ مہدی حسن کی آواز کا جادو اپنی جگہ مگر ممتاز شیرازی نے اپنی پرسوز آواز میں جے جے ونتی کے ملاپ سے پروین کے کلام کو بام عروج پر پہنچا دیا ہے۔ غلام علی حیرت انگیز طور پر دبے دبے سے نظر آتے ہیں شاید اس لئے کہ وہ الفاظ کی ادائیگی میں درشتگی پر تو زور دیتے ہیں ان کے ہاں احساس کا پرتو کم کم ہے۔

اس کتاب اور کیسٹ دونوں کا ٹائٹل صادقین نے سیاہ اور نیلے رنگوں میں انتہائی دیدہ زیب بنایا ہے۔ شاعری اور موسیقی کے رسیا اس دو آتشے کو اپنے لئے نعمت سے کم نہ پائیں گے۔ جو پروین شاکر کو فن کی ہی نہیں شہرت کے بھی ساتویں آسمان پر لے جائے گا۔

●

غیر ملکی دوستوں کے ہمراہ

آدم جی انعام یافتہ شعری مجموعہ

ضیاء محی الدین

لندن 4 جون جس مکتوب کا ذکر کیا تھا وہ حاضر ہے اگر آپ محسوس کریں کہ کسی پرچے میں چھپنا چاہئے تو میری طرف سے اجازت ہے ایک طرح میری طرف سے اس پیار اور عقیدت کا بر سر عام ذکر ہو جائے گا جو ان سطروں میں ہے اس صورت میں بہتر ہو گا کہ اپنے اشعار کو اس طرح لکھ دیجئے جیسے کاغذ پر لکھتے ہیں نہ کہ جیسے میں نے لکھا ہے یعنی ایک ہی لائن میں

لہجے کا مارا (ضیا محی الدین)

رات کی رانی کی خوشبو سے کوئی یہ کہدے
آج کی شب نہ میرے پاس آئے
پروین شاکر

لندن میں رہ رہ کر یہ شعر پڑھتا رہا۔
جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں۔
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے۔

دو ایک سے پوچھا کہ یہ شعر کس کا ہے؟ جب معلوم ہوا تو یہ اشتیاق ہوا کہ جانوں کہ یہ شاعر (مجھے لفظ شاعرہ یا مصنفہ یا مصورہ گو مصورہ نہیں کہتے مہمل سا لگتا ہے) کس عمر کی ہیں کہ شعر کسی ادھیڑ عمر شاعر کا نہیں محسوس ہوتا تھا۔ شاید انور مقصود جس نے بتایا کہ جوان شاعر ہیں۔ پھر ایک شعر کان میں پڑا۔

یا خدا اب تو کوئی ابر کا ٹکڑا برسے
بچیاں لائی ہیں گڑیوں کو جلانے کے لئے

میں نے سوچا یہ شعر بھی یا یہ لہجہ پروین شاکر کا معلوم ہوتا ہے میں ابھی یہ تصدیق نہیں کر پایا تھا کہ کسی نے، مجھے یاد نہیں نصرت نے یا ٹیلی ویژن کے کسی ایسے کارکن نے جو تمام ہم عصر شاعروں کے اچھے کلام کو اس طرح سناتا تھا گویا اچھا شعر صرف اس کے اپنے وجود سے عمل میں آیا ہو یہ شعر سنایا۔

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لا جواب کر دے گا

اب یہ واقعہ ہے کہ پہلی بار اس شعر کو سننے کے بعد اپنے ملک کے حساس ؟ ایک دوسرے کے کام کی بے حد تعریف کرنے والے افراد اور اپنے اوپر وجدان کی کیفیت اصل میں اس لئے طاری کرتے ہیں کہ انہیں وہ مکمل انسانیت سے بھرپور مشرقیت سے سرشار لڑکی نظر آتی ہے ان کے تمام جاننے والوں میں سے کوئی بھی اس طرح کی باہمی چھیڑ چھاڑ کی حامل نہیں ہو سکتی کہ لاجواب بھی اور مرد کی برتری کی جوں کی توں قائل یہ ہوا تا؟" یہ ہماری مشرقی اقدار کا نچوڑ ہوا کہ وہ عورت کیا ہوئی جو ہر وقت جرح کرتی رہے" اور پھر اس شعر میں تو انہیں عورت نہیں، لمس گداز سی لڑکی نظر آئی جس میں ابھی کوئی پکا پن نہیں آیا۔

ہمارے مردوں کی انا کی پرورش کے لئے اس سے بہتر اور شوخ شعر کہاں نصیب ہو سکتا ہے۔

پھر اس کے بعد کچھ اور شعر سنائے گئے (شاید اس لئے کہ کچھ لوگوں کو ایک غلط قسم کا خیال ہے کہ میں بہت شعر دان ہوں حالانکہ بہت سوں کی نسبت، میرا مطلب ہے بے شمار لوگوں کے مقابلے میں، کئی اشعار میری سمجھ میں بہت دیر بعد آتے ہیں)

کمال ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھوں سے اس کی دلہن سجاؤں گی
تو بدلتا ہے تو بے ساختہ میری آنکھیں
اپنے ہاتھوں کی لکیروں سے الجھ جاتی ہیں
طوفان ہے تو کیا غم مجھے آواز تو دیجئے
کیا بھول گئے آپ میرے کچے گھڑے وہ

(اور بھی) اشعار ہمارے لڑکوں، مردوں (شاید عفت مآب لڑکیوں کے لئے بھی) کے

لئے بہت انا بخش سند ہیں۔

واہ واہ یہ دیکھیے۔ ایک تنہا' دھانی پلکوں سے پیراستہ' سکھیوں کی سکھی' لاج کی دوتی مگر سورہ رحمان سے واقف' انگریزی ادب سے واقف لڑکی' پر شکر ہے بغاوت پر آمادہ نہیں' تمام گھریلو اچھائیوں سے بھرپور' تمام مقامی طریقوں سے واقف تمام اچھی معاشرتی قدروں کی ہمدرد!!!

یہ کہنے کی بات ہوئی۔

پھر انور سے کہا بھائی پروین شاکر کا کوئی کلام سناؤ اچھا پروین شاکر نے اس مسئلے پر کیا کہا ہے؟ کچھ تو اچھوتی بات کہی ہوگی جس سے جوان اور ادھیڑ عمر کے دو مرد آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو دیکھ کر بے ساختگی سے ہاتھ پر ہاتھ ماریں گے اور بغیر کچھ کہے یہ ثابت کریں گے

سمجھا کے ابھی گئی ہیں سکھیاں
اور دل ہے کہ پھر مچل رہا ہے

کے پیچھے جو تڑپ اور جذبہ ہے وہ صرف ان کی گرفت میں ہو کہ لڑکیوں کی اس قسم کی جلن اور خواہشوں کو ان کے علاوہ اور کون سمجھ سکتا ہے؟

مجھے اس قسم کی تنقید ہمیشہ سے کمزور محسوس ہوئی جس میں اس طرح کے رومانوی بے معنی فقرے ہوں' پروین کے نام سے جو ایک کلی چٹکی ہے اس نے فضا کو نئی مہکاروں سے معمور کر دیا ہے۔ اس کی آواز کے زیروبم میں روح عصر کی جھلک صاف سنائی دیتی ہے کون لکھنے والا ہے' کون تخلیق کرنے والی ہے جو اپنے ساتھ اپنے دور کی آواز نہیں لاتا (یا کسی دور کی) جو جانے پہچانے جذبوں کی گنڈمڈ میں اپنے تجربے سے اپنا حل تلاش نہیں کرتا؟ ظاہر ہے میں آسی رام نگری اور آنسہ نذر محمد کا ذکر نہیں کر رہا!

مجھے یاد پڑتا ہے کرشن چندر نے (جو ادیب تو شاید انگریزی کے ایک محاورے کے ترجمے کی رو سے غریب آدمی کے پریم چند تھے پر اوسط سے کم درجے کے تنقید نگار تھے) عصمت چغتائی کے بارے میں کچھ اس قسم کے فقرے لکھے تھے 'عصمت کا نام آتے ہی مرد ادیبوں پر دورے پڑنے لگتے ہیں۔ آپ ہی آپ خفیف ہوئے جا رہے ہیں۔

پطرس بخاری صاحب نے عصمت چغتائی پر جو مضمون لکھا تھا اس میں کرشن چندر اور ان کی طرح کے مداحوں کی خوب لے دے کی تھی کہ اس طرح سے مرد ادب اور عورت ادب کا تعین کرنے کا کیا مطلب؟

اب اس قدر میں ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ جتنے شعروں کا اوپر حوالہ دیا ہے اس سے ہمارے سب پڑھنے والے آپ کی "نسوانی بصیرت" اگر وہ بزرگ نسل کے ہیں یا آپ کے سچے نسائی محسوسات اگر وہ جوانوں میں سے ہیں کے قائل ہو کر آپ کو ایک ایسی خوبصورت لڑکی تصور کر لیں گے جو "خوبصورت پھول چن رہی ہے اور انہیں منقش گلدان میں سجائے جا رہی ہے۔

میں یہ کس طرح مانوں کہ ادب میں' مرد ہمیشہ مردوں ہی کی عکاسی اور ترجمانی کر سکتا ہے عورتوں کی' بچوں کی یا بچیوں کی نہیں؟ یا یہ صرف عورت ہی ادب میں عورتوں کے اصلی خیالات اور جذبات کا اظہار کر سکتی ہے ترگنیف کی عورتیں' ٹالسٹائی کی اینا کارینا' یا مسز گیسکل کے سکول ماسٹر' چلیے یہ کلاسیکی ادب ٹھہرا میری سیکارتھی' آئیوی کمپٹن برنٹ' مارگریٹ ڈریبل۔ یہ ہم عصر لکھنے والیاں ہیں۔ چلئے اور رومانیہ سے لے کر جاپان تک (دونوں) مرد اور عورت ہر طرح سے ایک دوسرے کے احساسات کو کھولتے پرولتے ہیں۔ کیا ہم کسی عورت کو اس لئے اصلیت پر تسلیم نہیں کرتے کہ اسے کسی مرد ناول نگار یا ڈرامہ نویس نے تخلیق کیا ہے؟ یا اس مرد کی قوت سے اس لئے منکر ہونے لگے کہ وہ آئرس مرڈاک کا تخلیق کیا ہوا ہے اور رو کیا جائے کہ جوان مرد حقیقت میں کس طرح محسوس کرتے ہیں؟۔

میں ذرا سا بکھر کر بات کر رہا ہوں۔ جان بوجھ کر میں سمجھتا ہوں کہ جب تک میں نے خوشبو کو پوری طرح پڑھا نہ تھا مجھے کچھ اس قسم کا موہوم سا خیال رہا کہ آپ نے اپنی حیثیت گویا انہی گرد پوش پر لکھے الفاظ کی مناسبت سے تسلیم کر لی ہے مگر یہ بہت سطحی خیال تھا میں جب اس شعر تک پہنچا۔

میں تیرا نام لے کر تذبذب میں پڑ گئی
سب لوگ اپنے اپنے عزیزوں کو رو لئے

دو چیزیں میرے ذہن میں آئیں۔ ایک یہ کہ آپ کی نظر صرف شعر بنانے پر نہیں' اپنے یہاں کی ہر حرکت پر ہے گو اس شعر کا

سوچوں تو وہ ساتھ چل رہا ہے
دیکھوں تو نظر بدل رہا ہے

دوسرے شعر کے ساتھ بظاہر کوئی واسطہ نہیں۔ پر مجھے ان دونوں میں وہ گہرائی نظر آتی ہے جو اپنی ذات سے باہر (اور اپنی جنس سے باہر) نکل کر مشاہدہ کرنے سے ہی آسکتی ہے۔ دیکھئے جب میں یہ کہتا ہوں کہ مرد اور عورت کی ادبی تقسیم نہیں ہونی چاہئے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان دونوں میں سے ایک خاص ذات سے تعلق رکھتے ہوئے وہ محرکات جو پاکستان جیسے معاشرے میں (دونوں کو) صرف اپنے اپنے ذہن (مخصوص ذہن) سے مل سکتے ہیں۔ شدت کے ساتھ سامنے نہ لائے جائیں وہ تھرتھراہٹ جو ہمارے ان ملکوں میں ایک چودہ سالہ لڑکی کا بیان لڑکی تو کر سکتی ہے پر وہ عورت بنے گی تو جیسے جولیٹ کا پارٹ (جولیٹ کی عمر صرف چودہ برس ہے) چودہ برس کی لڑکی نہیں ادا کر پاتی۔ (یہ بات کبھی فرصت ہوئی تو واضح کرنے کی کوشش کروں گا) اس لئے جب میں اس شعر تک آیا۔

تجھے سناؤں کہ اپنی انا کی بات سنوں
الجھ رہا ہے مرے فیصلوں کا ریشم پھر

تو میں جھوم اٹھا۔ یہاں ایک ذاتی مشاہدہ (نہ کہ صرف لڑکیوں کا مخصوص معاملہ) کائناتی چیز بن گیا' بلکہ مجھے یہ ایک ایسا تجربہ لگتا ہے جو ہر شخص کے ذہن پر بنتا ہے اور جس کے پیچھے (ہو سکتا ہے بنیادی طور پر نسوانیت کی وجہ سے) نفیس اور تیز سوچ ہے اور اپنی جنس سے باخبری ہے۔ کئی جگہ مجھے اس طرح کا تجربہ نکھرا نظر آیا۔

شبنم کے رخساروں پہ سورج کے ہونٹ
ٹھہر گیا ہے وصل کا اک روشن لمحہ

اور اسی کی شگفتہ اور طرار اور معاف کر دینے والی تقریباً ذاتی قدر کا مظہر یہ شعر

وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو میرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی

غالب جیسے بڑے شاعر سے لے کر سیماب اکبر آبادی جیسے شاعر تک شاید ہی کوئی ہو جس نے محبوب کی بے وفائی کا دکھڑا نہ رویا ہو۔ شروع شروع تو یا یوں کہئے کہ راشد صاحب سے پہلے (کاش ہم لوگوں میں اس قدر سکت ہو کہ کم از کم اس لئے انہیں بڑا شاعر تصور کر لیں کہ اب تو وہ گئے محبوب آتا تھا یا جاتا تھا۔ آتی جاتی نہ تھی اس لئے اساتذہ کے رنگ میں بھی یہ خوب ہے۔ پر ہرجائی کے لفظ سے جو پیار (یا جو وہ چاہے کرے والی سرمستی' سرمستی شاید غلط لفظ ہے وفور بہتر ہے) کی لپٹیں نکلتی ہیں' اس سے شعر کہیں کا کہیں پہنچ گیا ڈرتا ہوں کہ فلموں والے یہ سوچ کر ان کی شاعری میں تو ہرجائی وغیرہ کا ذکر ہے۔ فلموں کے لئے لکھنے پر مجبور نہ کریں یہ تو خیر ہوا ضمنی لطیفہ۔

غزلوں کی نسبت مجھے نظمیں کمزور لگیں۔ بیشتر نظمیں ایک طرح سے اکہری ہیں۔ اور ان میں وہ خیال اور مقصد ویسے ہی نظر آتا ہے جو شاعر کے ذہن میں تو ظاہر ہے ہوگا لیکن جس کے اظہار میں اکہرا پن ہے میں گہرائی اور گیرائی کی بات اس لئے نہیں کرتا کہ میں نہیں سمجھتا کس شاعر کو ارادی طور پر گہرائی نکالنی چاہئے۔ ہمارے یہاں تقریباً سبھی شاعر بہت شعوری طریقے سے اس آدرش کے پیچھے بھاگتے ہیں اسی لئے شعوری قسم کے شاعر ہوتے ہیں آپ کو یاد ہوگا تو میرے ساتھ مری جان کہاں جائے گی راہ میں اونچے پہاڑ آئیں گے اب یہاں سے لے کر مو قلم' ساز' گل ساز' تھرکتے پاؤں۔

بات کرنے کے بہانے ہیں بہت
آدمی کس سے مگر بات کرے

تک میں کتنا فرق اور سوچ کے اظہار میں کتنا عمل ہے۔

آپ کی ایک نظم میں' میں نے جب یہ سطریں پڑھیں کہ خواب جو تجزیہ ہیں ذات کا ان کو جب فرد کی خیندوں کی نفی کر کے لکھا جائے' تو اک قوم کا نا قابل تردید تشخص بن جائیں۔

تو مجھے یہ خیال آتا ہے کہ بہت اونچے جھتک کی نثر تو یقیناً ہے لیکن اتنا کچھ سمجھانے کے بعد آپ نے میرے لئے محسوس کرنے کو کچھ بھی نہیں چھوڑا' جذب کرنے کو اور بھی کم' یا جب آپ کہتی ہیں۔

گئے موسم کی شناسا خوشبو
یوں رگ و پے میں اترتی ہے
کہ جیسے کوئی چمکیلا' روپہلا سیال
جسم میں ایسے سرائت کر جائے
جیسے صحراؤں کی شریانوں میں پہلی بارش

تو مجھے اڑان کا احساس ضرور ہوتا ہے پر لفظوں کی اڑان کا اجلی میلفٹ نثر کی اڑان کا' سوچ کے پیچھے جذبہ' اور جذبہ کے پیچھے سوچ ایک چیز نہیں لیکن شاعری کی کمال حس چونکہ آپ میں موجود ہے یہ دونوں چیزیں۔ اس طرح کے مصرعے میں بڑے ستھرے رچاؤ سے ملتی ہیں۔

جلتے خیموں کی بجھتی ہوئی راکھ پہ بال کھولے ہوئے بیناں رہ گئیں

وہ لوگ جو آپ سے اونچا آدرش' انوکھا عقیدہ' گنجلک فلسفہ اور سخت ناقابل فہم الفاظ میں پیش کرنے کی فرمائش کرتے ہیں ان سے وہی سلوک ٹھیک ہے جو آپ نے بھولپن کا خول پہن کر اپنی نظم میں کہا ہے' وہ لوگ ہمارے یہاں کے اصلی راکھشش ہیں مجھے ایک ڈر ہے کہ کہیں آپ سب کی چہیتی شاعرہ نہ بن جائیں یہ میں سمجھتا ہوں بہت خطرے کی بات ہے (یا ہوگی) جس سوچ کی حدت اور جس احساس کی شدت سے یہ مصرع نکلتا ہے بال کھانے کے موسم ان پڑھ ہوتے ہیں۔

اس احساس میں ابھی بہت' بہت شاعری ہے!

ایک چھوٹی سی بات ----- جو کھٹکتی تو نہیں' پر جس سے کچھ کلیات حتمی سے معلوم ہوتے ہیں' تیور تُمر صرف عذاب ہی تو نہیں لاتے' سری راگ کو پھر سے سنئے ہمارے یہاں ایک خاص ریت یہ ہے کہ کومل سُروں کو حسن کے ساتھ منسوب کر لیا گیا ہے۔ یہ ایک خاص مفروضے کی بات کر رہا ہوں۔ آپ کی سنگیت ودیا کی نہیں۔

میری دعا ہے آپ اپنے اجلے ریشم لہجوں کی بانہیں اور پھیلائیں۔

خود کلامی سے انتخاب

○

○

کچھ تو ہوا بھی سرد تھی، کچھ تھا ترا خیال بھی
دل کو خوشی کے ساتھ ساتھ ہوتا رہا ملال بھی

بات وہ آدھی رات کی، رات وہ پورے چاند کی
چاند بھی عین چیت کا اُس پہ ترا جمال بھی

سب سے نظر بچا کے وہ مجھ کو کچھ ایسے دیکھتا
ایک دفعہ تو رُک گئی گردشِ ماہ و سال بھی

دل تو چمک سکے گا کیا، پھر بھی تراش کے دیکھ لیں
شیشہ گرانِ شہر کے ہاتھ کا یہ کمال بھی

اُس کو نہ پا سکے تھے جب دل کا عجیب حال تھا
اب جو پلٹ کے دیکھیے بات تھی کچھ محال بھی

میری طلب تھا ایک شخص وہ جو نہیں ملا تو پھر
ہاتھ دعا سے یوں گرا، بھول گیا سوال بھی

اُس کی سخن طرازیاں میرے لئے بھی ڈھال تھیں
اُس کی ہنسی میں چھپ گیا اپنے غموں کا حال بھی

گاہ قریبِ شاہ رگ، گاہ بعیدِ وہم و خواب
اُس کی رفاقتوں میں رات، ہجر بھی تھا وصال بھی

اُس کے ہی بازوؤں میں اور اُس کو ہی سوچتے رہے
جسم کی خواہشوں پہ تھے رُوح کے اور جال بھی

شام کی ناسمجھ ہوا پوچھ رہی ہے اک پتا
موجِ ہوائے کوئے یار، کچھ تو مرا خیال بھی

بے بسی کی ایک نظم

کیا اُس پہ میرا بس ہے
وہ پیڑ گھنا
لیکن کسی اور کے آنگن کا
کیا پھول مرے
کیا پھل میرے
سایہ تک چھُونے سے پہلے
دنیا کی ہر اُنگلی مجھ پر اُٹھ جائے گی
وہ چھت کسی اور کے گھر کی
بارش ہو کہ دُھوپ کا موسم

مرے اِک اِک دن کے دوپٹے
آنسو میں رنگے
آہوں میں سُکھائے جائیں گے
تہہ خانۂ غم کے اندر

سب جانتی ہوں
لیکن پھر بھی
وہ ہاتھ کسی کے ہاتھ میں جب بھی دیکھتی ہوں
اِک پیڑ کی شاخوں پر
بجلی سی لپکتی ہے
اِک چھوٹے سے گھر کی
چھت بیٹھنے لگتی ہے :

○

پاسبانی پہ اندھیرے کو تو گھر پہ رکھا
اور چراغوں کو تری راہگزر پہ رکھا

رہ گیا ہاتھ سدا تیغ و سپر پہ رکھا
ہم نے ہر رات کا انجام سحر پہ رکھا

ہاتھ اُٹھائے رہے ہر لمحہ دعا کی خاطر
اور الفاظ کو تنسیخ اثر پہ رکھا

بے وفائی مری فطرت کے عناصر میں تو تھی
تیری بے مہری کو اسبابِ دگر پہ رکھا

اتنا آسان نہ تھا ورنہ اکیلے چلنا
تجھ سے ملتے رہے اور دھیان سفر پہ رکھا

اُس کی خوشبو کا ہی فیضان ہیں اشعار اپنے
نام جس زخم کا ہم نے گلِ تر پر رکھا

پانی دیکھا، نہ زمیں دیکھی، نہ موسم دیکھا
بے ثمر ہونے کا الزام شجر پر رکھا

چہ کنم

بے بسی کے رستے پر
کیا عجب دوراہا ہے
ایک سمت بے سمتی
بے چراغ تاریکی
بے لباس ویرانی
بے لحاظ رسوائی
بے سواد قربانی
ہشت پایہ تنہائی
اژدری پذیرائی
گرگ زاد غم خواری
بے کنار روباہی
اور دُوسری جانب
قلعہ بند چاہت میں
دل کی آبروریزی!

چراغ مانگتے رہنے کا کچھ سبب بھی نہیں
اندھیرا کیسے بتائیں کہ اب تو شب بھی نہیں

میں اپنے زعم میں اک بازیافت پر خوش ہوں
یہ واقعہ ہے کہ مجھ کو ملا وہ اب بھی نہیں

جو میرے شعر میں مجھ سے زیادہ بولتا ہے
میں اُس کی بزم میں اک حرفِ زیرِ لب بھی نہیں

اور اب تو زندگی کرنے کے سو طریقے ہیں
ہم اس کے ہجر میں تنہا ہے تھے جب تبھی نہیں

کمال شخص تھا جس نے مجھے تباہ کیا
خلاف اُس کے یہ دل ہو سکا ہے اب بھی نہیں

یہ دستکیں، یہ مری زندگی کی آدھی رات
ہوا کا شور سمجھ لوں تو کچھ عجب بھی نہیں

یہ دُکھ نہیں کہ اندھیروں سے صلح کی ہم نے
ملال یہ ہے کہ اب صبح کی طلب بھی نہیں

حساب دربدری تجھ سے مانگ سکتا ہے
غریبِ شہر مگر اتنا بے ادب بھی نہیں

ہمیں بہت ہے، یہ سادات عشق کی نسبت
کہ یہ قبیلہ کوئی ایسا کم نسب بھی نہیں

باورڈ ممتاز شاعر ٹیڈ ہیوز کے ہمراہ

SPHINX

قلندر مومند

پشتو زبان میں ایک ضرب المثل ہے جس کا ترجمہ کچھ یوں کیا جا سکتا ہے کہ "انسان اگر زندہ ہو تو بہت سی چیزیں دیکھ لیتا ہے۔" اور اس ضرب المثل کا محل استعمال یہ ہے کہ جب کوئی پٹھان کوئی چونکا دینے والی حیران کن چیز دیکھ لیتا ہے تو اس وقت بے اختیار اس کے منہ سے یہ ضرب المثل نکل جاتی ہے اور اپنے اس حیران ہو جانے کو وہ اپنے زندہ ہونے کے ثبوت کے طور پر پیش کرتا ہے۔

پروین شاکر کی شاعری کو بھی میں ایک پٹھان ہونے کے ناطے اپنے زندہ ہونے کے ثبوت کے طور پر پیش کر سکتا ہوں۔ اگر خدانخواستہ میں اس وقت بقید حیات نہ ہوتا تو اتنی میٹھی اور اتنی روشن شاعری سے میں کس طرح لطف اندوز ہوتا۔

پٹھان ہونے کی حیثیت میں میرے زندہ ہونے کا ایک اور ثبوت بھی پروین شاکر کی شاعری سے حاصل ہوتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ پٹھانوں کا معاشرہ ایک انتہائی "مرکز" (MASCULINE) معاشرہ ہے ایسے معاشرے میں اگر کبھی کسی خاتون نے شاعری کی بھی ہو تو ہم اس کے پس منظر میں کسی "مرکز" کا ہاتھ محسوس کر کے اسے نظرانداز کرنے کے خوگر ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے معاشرتی ماحول میں جب ہم ایک جیتی جاگتی خاتون کو جیتی جاگتی شاعری کرتے ہوئے دریافت کر لیتے ہیں تو ہمارے لئے اس پر چونک جانا اسی طرح لازمی ہو جاتا ہے جس طرح کولمبس امریکہ کے ساحل پر لنگرانداز ہونے کے اتفاقی حادثے پر چونک اٹھا تھا۔

پھر میرے لئے پروین شاکر کی شاعری پر چونک اٹھنے کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ تیس برس کی صحافتی زندگی میں مجھے بے شمار ایسی خواتین فن کاروں سے واسطہ پڑا ہے جو "خواتین" ہو کر اپنے آپ کو خواتین ظاہر کرتے تھے/کرتی تھیں تاکہ اس طرح قارئین کو اپنی جانب متوجہ کر سکیں۔

اور حقیقتاً پروین شاکر کا فن مجھے اس وقت چونکا دیتا ہے۔ جب میں ان کی شاعری میں بیک وقت عربی، انگریزی، فارسی اور ہندی ادب کا ایک ایسا ممزوج دریافت کر لیتا ہوں۔ جو ہماری اردو شاعری میں قطعاً ناپید ہے۔ اور اس وقت تو بے اختیار چونک اٹھتا ہوں جب عربی اور فارسی سے قطعاً بے بہرہ سامعین اور قارئین کو بھی ان کی شاعری کی تعریف کرتے اور لکھتے ہوئے پاتا ہوں۔ اور مجھے خیال گزرتا ہے کہ اگر SPHINX کا دیومالائی تصور پروین شاکر کی شاعری کے بارے میں راہ ادب کے مسافروں سے سوال کر بیٹھتا تو ایسے حضرات و خواتین کا کیا بنتا؟

میرے اپنے دل میں اپنے لیے کوئی عزت نہیں ہے۔ مگر جب محترمہ پروین شاکر نے مجھے اس تقریب میں اظہار خیال کے لیے کہا تو اپنی ساکھ اپنی نظر میں بھی ہمک اٹھی۔ پروین شاکر۔ اب شعری منزلت کے اس زینے پر نہیں ہے کہ آدمی اس "بی بی" کو "بے بی" "نور چشمی" وغیرہ کہہ کر۔ "لا نبجے" ہو جائے۔ اس کے شعر کی خوشبو سے تو جدید اردو شاعری کا سارا گلستان مہک رہا ہے بلکہ بہت سی طوطیاں اور عندلیبان اس کے لہجے کو "اڑا کر" اب اسی کے پروں پر اڑ رہی ہیں وہ ان چند آوازوں میں سے ہے جن کو اس دور کی شعری دریافت کہنا چاہیے منصف، حکمران اور اچھے شاعر کے درمیان بھی ایک قدر مشترک ہوتی ہے وہ یہ کہ آدھا ملک منصف حکمران کے خلاف ہو جاتا ہے اور اسی طرح ملک کے آدھے شعرا ---- اچھے شاعر کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ تو اس زاویے سے بھی۔ انکار کی شاعرہ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لڑکیاں بہت جلد جوان ہو جاتی ہیں۔ پروین تو شاعری کے حساب سے پیدا ہی جوان ہوئی ہے۔ ملک خداداد پاکستان کے مانند مجھے

کہ ملک نیا قوم پرانی۔

پروین شاکر۔ شاعری کے "غیر مقلدین" میں سے ہے۔ اس اعتبار سے بھی یہ امر اس کی غیر معمولی اہمیت کی دلیل ہے کہ اسے۔ اس قدر وسیع پذیرائی زندگی ہی میں حاصل ہو گئی۔ اور ماشاء اللہ بہت جلد ملی۔ ورنہ کلیہ یہ ہے کہ "مقلدین" کی پذیرائی (جیسا کہ استاد ذوق) "عموماً ان کی زندگی میں ہوتی ہے اور غیر مقلدین کا غلغلہ "راولا رپا" وغیرہ۔ (جیسا کہ میرزا غالب کا) مرنے کے بعد:۔

تو "انکار" پر اظہار خیال کرنا میرے لیے ایک اعزاز ہے۔ مگر ہر اعزاز کی طرح ایک آزمائش بھی ہے۔ یہ وہی فرق ہے جو اعزاز اور اعتراز میں ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ اس تقریب کا اہتمام "دائرہ" نے کیا ہے۔ تقریب طرازی کی سبیل سے "دائرے" کے سینے پر "کانسی اور تانبے کے تمغوں" کی تو لمبی قطاریں لٹک رہی تھیں مگر "طلائی تمغے" اس انجمن نے اب تک بمشکل دو تین ہی کمائے ہوں گے۔ بارے کہ اس کی فرد عمل میں آج ایک بہت روشن تمغے کا اضافہ ہو گیا۔

اصولی طور کتابیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ اچھی کتابیں۔ یا بری کتابیں۔ البتہ فروعی جھگڑا یوں نکل آتا ہے کہ۔ ہم سوچتے تو اجمال میں ہیں اور رہتے تفصیلات میں ہیں مطلب یہ کہ بعض کتابیں چبا چبا کر پڑھنے والی ہوتی ہیں اور بعض بس غڑاپ سے پی جانے والی کہ ادھر حلق سے اتریں اور ادھر ہضم۔ مگر "انکار" ان بیک وقت لذیذ اور فکر انگیز کتابوں میں سے ہے جو کھائی بھی جاتی ہیں اور چبائی بھی جاتی ہیں۔ یعنی یہ قاری کو بار بار اپنی طرف بلاتی رہتی ہے۔ ایسی شاعری سے کہ بیر تیس شعر شعر پر۔ نقاب الٹ رہی ہوں عہدہ بر آ ہونا کار دارد۔ میری کیفیت اس عمل میں کچھ وہی ہوئی جو ایک مرتبہ محترم دوست (ممتاز دانشور شاعر کالم نگار اور حکومت پاکستان کے ایک سابق سیکرٹری وزارت داخلہ) چوہدری فضل حق صاحب کی ہوئی تھی جب وہ ایک نوجوان پولیس افسر کی حیثیت سے کسی کورس پر انگلستان گئے تو برطانیہ کے تاریخ ساز وزیر اعظم سر ونسٹن چرچل سے "خصوصی انٹرویو" کا "پنگا" لے بیٹھے۔ خدا معلوم چوہدری فضل حق نے مسٹر چرچل کو کس طرح "ہینڈل" کیا۔ میں تو اپنے اس بحران میں سے اس طرح نکلا ہوں جس طرح دریا میں ڈوبنے والے آدمی کو بعض اوقات خود لہریں اچھال کر کنارے پر پھینک جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے سراسیمہ آدمی سے آپ گفتار میں کسی ترتیب کی توقع نہیں کر سکتے۔ البتہ گزارشات اگر کسی قدر طویل ہو جائیں تو اس کے لیے درگزر کا خواہاں ہوں۔ بری عادت آسانی سے نہیں چھوٹتی میں اگر خدانخواستہ کسی روز چار پانچ منٹوں میں اپنے مقالے کے مرکزی نکتے تک پہنچ گیا تو مجھے ڈر ہے کہ میرے لکھنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جائے گی۔

دشواریاں کئی تھیں۔ پہلی تو وہ دشواری تھی جس کی نشان دہی خود پروین نے اپنے ایک مصرعے میں اس طرح کی ہے۔

ساده ہے بہت وہ نہ میں آسان بہت ہوں

یہ تو خیر فکری دشواری تھی مگر ایک جغرافیائی گھاٹی بھی خاصی دشوار گزار نکلی۔ وہ تھی مقالے کی چنائی کے لیے اشعار کے چناؤں کی مشکل۔ یہ اس قسم کی دشواری تھی جو زندگی میں اکثر آدمی کو محسوس ہوتی ہے کہ دنیا میں خوبصورت عورتیں بہت ہوتی ہیں اور وقت کم ہوتا ہے۔ اس شعری مجموعے میں بھی ' خوب صورت اشعار کی تعداد بہت زیادہ تھی اور میرے پاس ' جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ وقت کم بلکہ بہت کم ہے۔ مجبوراً صرف چند اشعار پر اکتفا کیا۔

لشکر کی آنکھ مالِ غنیمت پہ ہے لگی!
سالارِ فوج اور کسی امتحان میں ہے

اُس کا بھی دھیان، جشن کی شب اے سپاہِ دوست
باقی ابھی جو تیرے عدو کی کماں میں ہے

مسند کے اتنے پاس نہ جائیں کہ پھر کھلے
وہ بے تعلقی جو مزاجِ شہاں میں ہے

اب تو فقط قیاس سے راہ کوئی نکالی جائے
جن میں تھیں کچھ بشارتیں خواب تو وہ تلف ہوئے

یہ بھی کیا کم ہے کہ اپنی جنگ میں تنہا نہیں
کار زارِ زندگی میں میرا اک لشکر تو ہے

راہِ دشوار کی جو دھول نہیں ہو سکتے
ان کے ہاتھوں میں کبھی پھول نہیں ہو سکتے

حاکمِ شہر کے اطراف وہ پہرہ ہے کہ اب
شہر کے دکھ اسے موصول نہیں ہو سکتے

دینے والے کی حقیقت پہ ہے سب کچھ موقوف
مانگنے والے کی حاجت نہیں دیکھی جاتی

گھر ڈوب گیا اور انہیں آواز نہیں دی
حالانکہ مرے سلسلے اس پار بہت تھے

ہم اہلِ حاجت دار بابِ احتیاج تو کیا
قبیلۂ شہر بھی اب حبِ زر پہ زندہ ہیں

اس پھول میں اک پھول کھلا میرے لئے بھی
خوشبو کی کہانی میں مرا نام تو آیا

مرے قبیلے میں نکلے سبھی فروختنی
نہ کوئی وعدہ، نہ کوئی اصول باقی ہے

ایک پل میں گزر گئی وہ شام
صبح سے انتظار تھا جس کا

رستے میں مل گیا تو شریکِ سفر نہ جان
جو چھاؤں مہرباں ہو اسے اپنا گھر نہ جان

دکھ سے بھری ہے لیکن میسر تو ہے حیات
اس رنج کے سفر کو بھی بارِ دگر نہ جان

گھنے درختوں کے گرنے پہ ماسوائے ہوا
عذابِ دربدری اور کون سہتا ہے

مرے بدن کو نمی کھا گئی ہے اشکوں کی
بھری بہار میں کیسا مکان ڈستا ہے

ہوا کا زور کسی شب تو جا کے ٹوٹے گا
بچا کے رکھنا ہے کوئی دیا مکاں کے لئے

سفر کے باب میں کتنے عجیب لوگ ہیں ہم
کہاں کا قصد کیا، چل پڑے کہاں کے لئے

ہوا پہ لکھا ہوا حرف ہی سہی دُنیا
تمام رنگ اسی نقش رائیگاں کے لئے

پیوند کہاں تک لگیں اب خرقۂ غم کو!
اس پرسشِ رسوائی کو تبدیل کیا جائے

اک چادرِ دلداری ہے اس طرح سے مجھ پر
تن ہے کہ جو الجھا ہے سر ہے کہ کھلا جائے

اے گردشِ دوراں ترے احسان بہت ہیں
کچھ دیر ترے ساتھ بھی اب رقص کیا جائے

جیسے کوئی عقب سے بلاتا ہے بار بار
بچپن سے اک عجیب سرابِ صدا میں ہوں

"انکار" میں غزلیں بھی اور نظمیں بھی، سچائی کا جوہر اپنے مختلف مظاہر میں، دونوں طرف برابر روشن ہے۔ جذبے کا الاؤ بھی۔ اظہار کی خوشبو اور چاندنی کا رقص بھی، مجھے اس کی غزل زیادہ مرغوب معلوم ہوئی۔ میرے نزدیک اس "شہر نوا" کا مرکزی آہنگ، بلکہ "چنبیلی چوک" غزل ہی ہے۔ تقابل مقصود نہیں مگر غزل گاڑھی اور گھنی ہے۔ نظم کھلی اور کھلیانی۔ ہر گل را رنگ وبوئے دیگرے------ غزل آدم گری کرتی ہے اور نظم شیشہ گری------ یہ وہی فرق ہوا جو نغمہ خوانی اور جہاز رانی میں ہے------ "انکار" کی ایک انفرادیت یہ ہے کہ خواہ------ کسی شاخ سبز کی اوڑھنی پر ہلکی سی گوٹ لگی ہو۔"------یا------دیار غزال چشماں وگل عذاراں کی بشارتیں ہوں"

"یورپ کے کوہستانوں میں برف پگھل رہی ہو"------یا------"کسی شہزادی کا المیہ"------یا بے شک کہیں "انقلاب کی آگ بھڑک رہی ہو------ الغرض جو بھی کچھ ہو، بس اسی قدر ہوتا ہے کہ شاعری کے لئے بھی وہاں بہت وافر جگہ موجود رہتی ہے۔ پاکستان کے------ "فیوڈل لینڈ لارڈوں"------ والی بات نہیں------ کہ ملک بیشک ختم ہو جائے مگر "جاگیر" ختم نہ ہو۔ پروین شاکر ایک انقلابی شاعرہ ہے مگر اس کے شعر میں نعرے کا واویلا------ دھیمے سروں ہی میں رہتا

ہے۔ اس کے ہاں "رباب" "کا انقلاب ہے" "ڈھول کا انقلاب" نہیں ہے۔ اس شہر میں جمہوریت تو آتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں آٹے کا تھیلا بھی ہوتا ہے نئی دنیا کیلئے بشارتیں اور سماجی معاشی عدل مع روٹی' کپڑا اور مکان وغیرہ کے' مگر تھیلا ریشمی جارجٹ کا ہوتا ------ پروین شاکر کا ایک شعر ہے ؎

تجھ کو بھی نہ مل سکی مکمل!
میں اتنے دکھوں میں بٹ گئی ہوں

پروین شاکر کوئی سطحی شاعرہ نہیں کہ اس کے فن و فکر کے مختلف زاویوں کا مکمل جائزہ آسانی سے گرفت میں آسکے۔ تاہم تین دھارے جن کو آشوبِ ذات' آشوب کائنات اور آشوب وطن کے حوالوں سے شناخت کیا جا سکتا ہے۔ پہلو بہ پہلو بہتے دکھائی دیتے ہیں۔ آشوب ذات کی نسبت سے نسائی حیات و محسوسات کے جو سائے "انکار" میں جھلکتے ہیں اور عورت کی آواز جو کرب اس کے اشعار میں تڑپا ہے' وہ ایسی سندرتا' جرات اور گمبھیرتا کے ساتھ کہیں کہیں ہی دیکھنے اور سننے میں آیا ہے۔ پروین شاکر اردو شاعری کی غالباً وہ پہلی منجھی شاعرہ ہے جو غزل میں "اردو غزل کے عاشقوں" جیسے شعر کہتی ہے کہ صداقت اس کے فن کا بنیادی جوہر (بلکہ آدرش) ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ اپنے ایک شعر میں پروین نے یہ تک بتا دیا کہ وہ اب اپنی عمر کے ------ "ڈھلتے حصے" میں ہے ------ یہ بات کوئی غیر معمولی بہادر خاتون ہی کہہ سکتی ہے۔

اس نے ایک نظم میں ------ انسانوں کے روپ میں بھیڑیوں کا ذکر کیا ہے' جن کے غول' اس کے اطراف منڈلاتے رہتے ہیں۔ اس کی زندگی جتنی حقیقی سرگزشت خود اس کے شعروں سے نچوڑی جا سکتی ہے۔ عہد حاضر کے بہت کم شعراء کے دواوین میں ملے گی۔ شاید اسی لئے اس نے منظومات پر تاریخیں نہیں دیں۔ اس کے ہاں اداس نظمیں بھی ہیں ------ اور شریر نظمیں بھی ہیں ------ اداس نظمیں ------ اداس تو بہت کرتی ہیں۔ مگر آرزوئے حیات کی چنگاری کو بجھنے نہیں دیتیں' اگرچہ زندگی ہمیشہ اس کے لئے چھوٹی چادر رہی ہے ؎

ممکن ہے باغ کو بھی نکلتی ہو کوئی راہ
اس شہرِ بے شجر کو بہت بے ثمر نہ جان

اور

زمینِ دل یونہی شاداب تو نہیں اے دوست
قریب میں کوئی دریا ضرور بہتا ہے

"شریر نظمیں" خاصی شریر اور چنچل ہیں۔ ان کے بارے میں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ احرام پہن کر لکھی گئی ہیں مگر فن کی خوب صورت رفوگری کے طلسم سے ان میں وہ بات بھی نہیں کہ شعر پڑھتے ہی آدمی گنہگار ہو جائے۔

میں تو تا عمر ترے شہر میں رہنا چاہوں
کوئی آکر ------ مرا اسبابِ سفر تو کھولے

آفاقیت کے سفر کے بغیر کوئی شاعری مشتری' مریخ کے مدار میں داخل نہیں ہو سکتی اور یہ سفر اس کے ہاں نگاہ کی ایسی بے تابی اور لفظ کی دل نوازی کے ساتھ موجود ہے کہ خاندان اور نسل تو کیا معنی ------ کہیں کہیں وہ قوم اور ملک کے "زندانوں" سے بھی نکل جاتی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ کراچی کے سانحات پر اس درد سے روتی ہے کہ جیسے اقبال غرناطہ پر رویا تھا۔ اس کی نظم ------ "سندھ کی ایک بیٹی کا اپنے رسول سے سوال" ------ پاکستان کے ------ "سانحاتی ادب" میں کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی۔ وطن کی محبت کا سوتا اس کی زمین شعر سے بار بار پھوٹتا ہے اور دیکھئے کہ اخلاص کی کیسی بے ساختہ وارفتگی کے ساتھ ؎

زندگی کی دھوپ میں اس سر پہ اک چادر تو ہے
لاکھ دیواریں شکستہ ہیں پر اپنا گھر تو ہے
جو بھی آئے گا یہاں دستک تو دے کر آئے گا
اِک درِ دیوار تو ہے' اک حصارِ در تو ہے

ملک پر مارشل لاء کا تسلط پروین شاکر کی روح کا سب سے بڑا گھاؤ معلوم ہوتا ہے۔ اس کتاب کی اگر سب نہیں تو بیشتر نظمیں مارشل لاء کی طویل رات میں لکھی گئی ہیں۔ یہ گویا مارشل لاء کے خلاف جمہوریت کے ایک "لانگ مارچ" کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مارشل لاء کا اگر کوئی فائدہ ہوا تو یہی کہ پروین نے قلم کو ------ "کلاشنکوف" بنا لیا اور وہ اردو شاعری کی "سیفو" بنتے بنتے اردو شاعری کی "رانی جھانسی" بن گئی اور میں سمجھتا ہوں کہ اس زمانے کے ایک مقبول عوامی گیت کا یہ مصرعہ ہم پروین شاکر کے لئے بھی دہرا سکتے ہیں کہ

؎ خوب لڑی مردانی ------ رانی جھانسی کی

اس کی گہری اداسی بھی مارشل لاء کی پیداوار ہے۔ میرے لئے یہ بات ایک انکشاف تھی کہ حکومت نے اس کو ملک سے باہر جانے سے روکا تھا۔ یہ تو اس کی ہمت تھی کہ وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے' کسی نہ کسی' غیر ملکی مشاعروں میں پہنچتی رہی۔

ایک سرکاری ملازم کی حیثیت سے بھی' اپنی مجبوری کے احساس پر وہ بہت آزردہ دکھائی دیتی ہے "انکار" کی مصنفہ ------ سرکاری ٹیلی ویژن کے پروگراموں سے "انکار" تو نہ کر سکی۔ مگر وہ سرکاری جبر کے خلاف نظمیں لکھتی رہی اور جہاں جہاں اسے بولنے کا موقع ملا وہ برملا بغاوت بولتی ہی رہی ------ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے جن اہل قلم نے ------ آمریت کے کوڑے کے کس بل نکالنے میں مجاہدانہ جوش و جذبے کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان میں پروین کا نام بہت نمایاں نظر آتا

ہے۔ وہ چاہتی تو باہر جا کر جرمنی کی جنگ جاپان سے بھی لڑ سکتی تھی مگر اس نے جمہوریت کا معرکہ "سٹالن گراڈ" اپنے شہروں کے گلی کوچوں ہی میں رہ کر لڑنے کو ترجیح دی۔

پروین کی "مارشل لائی نظموں"۔۔۔ میں سے ایک نظم مجھے آج کی صورت حال میں خصوصی طور پر یاد آگئی۔ میں یہاں اس کی صرف ایک "لائن" ہی نقل کر رہا ہوں کہ نظم کا سارا "حت" سمٹ کر اسی ایک "لائن" میں آگیا ہے۔ اور وہ یہ کہ!

"اے خدا!"

میرے پیارے سپاہی کو سرحد کا رستہ دکھا۔"

یہ نظم میرے ذہن میں شاید اس لئے شدت کے ساتھ ابھر آئی کہ اب ہم خود اپنے پیارے سپاہی کو سرحدوں سے بلا کر کراچی اور حیدر آباد کے شہروں میں ریت کی بوریوں کے مورچے بنوانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ اردو شاعری کی "رانی آف جھانسی"۔۔۔ جس دلیری سے آمریت کو للکارتی رہی تھی اب جمہوریت کے شگافوں کی نشاندہی بھی کرتی رہے گی اور اپنے اسی مخصوص لہجے میں کہ: ؎

ایک سیلاب سے ٹوٹا ہے ابھی ظلم کا بند
ایک طوفاں کو ابھی زیرِ زمیں رکھنا ہے

اور بی بی!

اب خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

پروین!۔۔۔ تمہیں یہ "نثری نظم" کا "دھماکہ" کرنے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔ تجربات کا دریچہ بے شک ہمیشہ کھلا رہنا چاہیئے۔ مگر یہاں تو تجربہ کا "درہ خیبر" کھل گیا۔ یہ تو شاعری کی "ہارس ٹریڈنگ" ہوئی۔ جس کو مولانا شبلی نعمانی نے "محرمازاری" لکھا تھا۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ جب کسی کالج کو اپنے طلباء میں دلچسپی نہیں رہتی تو اس کالج کو یونیورسٹی بنا دیا جاتا ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ جس شاعر کو شاعری میں دلچسپی باقی نہیں رہتی وہ نثری نظم لکھنے لگ جاتا ہے۔ شاعروں کی بنیادی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو شاعری سے چمٹ جاتے ہیں دوسرے وہ جو شاعری کو اوپر اٹھا لیتے ہیں۔ آپ تو گرتی شاعری کو تھام لینے والی شاعرہ ہیں۔ اگر آبشار نیاگرہ سے بھی قطرہ قطرہ شبنم ہی رسنے لگی تو شاعری میں صرف "ہارس ٹریڈنگ" ہی باقی رہ جائے گی۔

ایک گلہ ذرا ذاتی نوعیت کا ہے میں اس کتاب میں وہ نظم ڈھونڈتا رہا جو آپ نے بریگیڈیئر صدیق سالک کی رحلت پر لکھی تھی؟

تنقید کا خمار بھی اقتدار کے نشے سے کم نہیں ہوتا۔ میں یہ چند باتیں شاید اسی "خمار" میں کہہ گیا۔ نقادوں نے قلوپطرہ کو بھی نہیں بخشا تھا۔ جب کہا کہ اگر اس بی بی کی ناک قدرے چھوٹی ہوتی تو تاریخ عالم کا چہرہ ہی بدل جاتا۔ بہر حال واقعہ یہ ہے کہ "انکار" ہر معیار شعری کے حوالے سے نہ صرف عصری شاعری کا ایک درخشندہ نمائندہ مجموعہ ہے بلکہ اس سے شاعری کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا ہے اور اس اعتبار سے تو یہ ایک منفرد کتاب ہے کہ بہت لوگ اس کتاب کو بہت پسند کریں گے مگر بہت کم لوگ خوش ہوں گے۔ کیونکہ اس کے ہاں ہمارے بعض زنگ آلودہ معاشرتی، معاشی رویوں پر تنقید بھی موجود ہے اور ہم بحیثیت قوم تنقید سے سدھرنے کی بجائے تعریف سے تباہ ہونے کو پسند کرتے ہیں۔ مگر شاید اسی حوالے سے بعض طبقوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری بھی ہو گیا ہے۔ مثلاً ارباب حکومت کے لئے تاکہ وہ کیکر نرسریوں کی ترقی و تقرری کے معاملے میں اعلیٰ انسانی قدروں کو ملحوظ رکھا کریں۔۔۔ فوج کے جوانوں کو بھی اس کا ترجمہ پڑھوانا سود مند ہو گا۔ تاکہ وہ یہ سمجھ سکیں کہ۔۔۔ قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے؟۔۔۔ اور اس کی عورتوں کے لئے تو یہ ایک خصوصی ادبی دستاویز ہی نہیں بلکہ ایک "منشور حریت" کی حیثیت رکھتی ہے کہ اس کے اشعار میں ایک عورت ہی کا دل تو دھڑک رہا ہے۔ اور میں صدقِ دل سے یہ سمجھتا ہوں کہ نہایت خوب صورت اور نہایت خیال انگیز شاعری کی یہ کتاب ہر دلہن کے جہیز میں شامل ہونی چاہیئے کیونکہ۔۔۔

"لونگ تو "گراچ" بھی جاتا ہے مگر لفظ کبھی نہیں گواچتا"

(19 جولائی 1990ء کو اسلام آباد میں "انکار" کی تعارفی تقریب میں پڑھا گیا)

اکبر حمیدی کی کتابیں

1۔۔۔ لہو کی آگ ۔۔۔ شاعری ۔۔۔ 1970ء
2۔۔۔ آشوبِ صدا شاعری 1977ء
3۔۔۔ جزیرے کا سفر انشائیے 1985
4۔۔۔ تلوار اس کے ہاتھ شاعری 1986ء
5۔۔۔ ریڈیو کالم 1987ء
6۔۔۔ دی ڈے شیل ڈان 1988ء اردو غزلیں انگریزی تراجم
7۔۔۔ تتلی کے تعاقب میں ۔۔۔ انشائیے 1990ء
8۔۔۔ شہر بدر ۔۔۔ شاعری 1991ء
9۔۔۔ مضامینِ غیب ۔۔۔ تنقیدی مضامین ۔۔۔ 1992ء
10۔۔۔ قد آدم ۔۔۔ خاکے ۔۔۔ 1993ء
11۔۔۔ میری بستی ۔۔۔ انشائیے ۔۔۔ زیر اشاعت
12۔۔۔ میرا فریاپا ہوا زیر اشاعت

معتبر پبلشرز پوسٹ بکس 2053-اسلام آباد

پولیس کا ہے فرض مدد آپ کی

گوشۂ چشم

کالم

پروین شاکر

پنجاب پولیس کی لیاقت کے ہم شروع دن سے قائل ہیں۔ لیکن اسے علم طب میں بھی درک حاصل ہوگا' اس کا ہمیں اندازہ نہیں تھا۔ اب جو یہ ذاکر حسین کا قصہ چلا تو معلوم ہوا کہ انہیں تو سالہ میں اناٹومی بھی پڑھائی جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا گرے کی اناٹومی سے کوئی تعلق نہیں جس پر ہمارے ڈاکٹر صاحبان میڈیکل کالجوں میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ آخر اجتہاد بھی کوئی چیز ہے ۔

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے!

اب یہی دیکھئے کہ ایس پی چکوال صاحب بضد ہیں کہ یہ جو ذاکر حسین کی حالت دگرگوں ہوئی ہے تو اس کا سبب اس کے ہرنیا کا ناکام آپریشن ہے۔ جبکہ راولپنڈی جنرل ہسپتال کے ڈاکٹر صاحبان کا کہنا ہے کہ اول تو ذاکر حسین کو ہرنیا کا مرض نہیں تھا اور بالفرض تھا بھی تو جائے واردات (مضروب کا پیٹ) سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ گویا پولیس کی زبان میں اس مرض کا تھانہ کہیں اور لگتا ہے۔ ایک دل جلے ڈاکٹر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر پولیس اب بھی اپنے موقف پر قائم ہے کہ ہرنیا پیٹ میں ہوتا ہے تو پھر یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب دل کا دورہ ٹانگوں پر پڑنے لگے ۔

مچھلیاں پیڑ پہ چڑھ جائیں' ہرن تیرا کریں

ڈاکٹر صاحب کو پنجاب پولیس کی طاقت کا اندازہ نہیں۔ ہرنیا کی کیا مجال کہ ایس پی صاحب کے حکم سے سرتابی کرے۔ جہاں حکم دیں گے' وہیں سے برآمد پیش کردے گا۔ بلکہ ایک ہرنیا پر ہی کیا موقوف' ذاکر حسین کے باقی ماندہ جسم میں جتنے بھی اعضائے رئیسہ اور امراض کبیرہ موجود ہیں' سب اپنی اپنی نشستیں بدلنے کو تیار ہو جائیں گے' چاہے اس بات پر اس کی برادری ساری عمر اسے لوٹا کہتی رہے۔

جان ہے تو جہان ہے پیارے!

ایس پی صاحب کا وضاحتی بیان اس سے بھی زیادہ ایمان افروز ہے۔ فرماتے ہیں کہ تلہ گنگ تھانے کے خاکروب ذاکر حسین پر پولیس نے کسی قسم کا تشدد نہیں کیا۔ نہ ہی پولیس تشدد سے اس کا پیٹ پھٹا ہے اور انتڑیاں باہر نکل آئی ہیں۔ ہم ایس پی صاحب سے بالکل متفق ہیں۔ ذاکر حسین نے یہ سب کچھ ازراہ تفنن کیا ہے۔ ایس پی صاحب نے ذاکر حسین کی آنتیں باہر نکلنے کی ایک وجہ یہ بتائی ہے کہ بیس سال قبل ذاکر حسین کے اپنڈکس کا آپریشن ہوا تھا۔ سچ پوچھئے تو یہ پڑھ کر ہمیں جھرجھری آگئی۔ بیس سال قبل ہمارا بھی اپنڈکس کا آپریشن ہوا تھا۔

ایس پی صاحب کے کہنے کے مطابق یہی بیماری جب بڑھ گئی تو تلہ گنگ کے ایک ڈاکٹر نے اس کا آپریشن کر دیا۔ گرین کی وجہ سے ذاکر حسین کے پیٹ کی جلد گل گئی۔ اس حالت میں یہ غریب خاکروب' چالیس روپے کے ایک قضیے میں کہ نصف جس کے بیس روپے سکہ رائج الوقت بنتے ہیں' تلہ گنگ تھانے لایا گیا تو اس پر ایک سپاہی نے لتر مارے تھے جو سب کے سامنے مارے گئے تھے' تاہم پولیس کے خلاف کوئی جرم نہیں بنتا۔ پولیس والے بری الذمہ ہیں۔ اگر ذاکر حسین کی موت واقع ہو گئی تو اس صورت میں ڈاکٹر کے خلاف قتل کا مقدمہ درج ہو سکتا ہے۔

اس روح افزا بیان کے کئی پہلو توجہ طلب ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ لتر مارے گئے تھے مگر چونکہ سب کے سامنے مارے گئے تھے' لہٰذا انہیں جمہوری تحفظ حاصل ہے۔ دوسرے یہ کہ لتر مارنا کوئی جرم نہیں۔ تیسری اہم بات وہ خفیہ دھمکی ہے جو نہ صرف تلہ گنگ بلکہ سو میل کے قطر میں موجود ہر اس ڈاکٹر کے لئے ہے جس نے گزشتہ بیس برسوں میں کبھی ذاکر حسین کا علاج کیا تھا۔ ہماری مانیں تو آئندہ کے لئے راولپنڈی ڈویژن کے تمام ڈاکٹر صاحبان پریکٹس شروع کرنے سے پہلے' ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست بھی دے دیا کریں۔

ابھی ہم ایس پی صاحب کے بیان سے پوری طرح جانبر نہ ہوئے تھے کہ ایس ایس پی صاحب بھی حکمت کے موتی رولنے آگئے۔ فرمایا ذاکر حسین پر "مکمل" طور پر تشدد نہیں کیا گیا۔ اسے صرف ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لئے تھانے میں رکھا گیا اور اسے ٹارچر سیل یا ڈرائنگ روم میں نہیں رکھا گیا۔

اگر نامکمل تشدد سے ذاکر حسین کی یہ حالت ہو گئی تو سمجھ دار قارئین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مکمل تشدد کیا کرشمے دکھاتا ہوگا اور جہاں تک تھانے میں صرف ڈیڑھ گھنٹے بٹھائے رکھنے کا تعلق ہے۔ ذاکر حسین کو اپنے قیام کے اس اختصار پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس سے ایک آدھ منٹ آگے اگر موصوف تجاوز کر جاتے تو آج ان کے قل ہو رہے ہوتے اور کہیں ٹارچر سیل یا ڈرائنگ روم تک نوبت جا

پہنچی تو ذاکر حسین کا تو کچھ نہ بگڑتا' اس لئے بننے بگڑنے کے لئے بنیادی شرط زندہ رہنے کی ہے۔ البتہ پولیس والوں کا کام بڑھ جاتا۔ تین سو دو (302) کے مقدمے کو تین (309) کا کیس بنانا پڑتا۔

بنیادی طور پر یہ کوئی بہت غیر معمولی واقعہ نہیں۔ ایک غریب خاکروب پر چوری یا نادہندگی قسم کا کوئی الزام تھا۔ تھانے میں بلا کر پوچھ گچھ کی گئی۔ اس پر مغز گفتگو میں سے ناقابل اشاعت الفاظ نکال دینے کے بعد یہی لتر اور چھتر بچے تھے۔ جن کے فیاضانہ استعمال کے بعد غریب ذاکر حسین گفتگو کے قابل نہ رہا اور اب مقطع میں سخن گسترانہ بات یہ آن پڑی ہے کہ ذاکر حسین کا مرض الموت (جو زیادہ دور نہیں) کاغذوں پر کیا لکھا جائے۔ ہرنیا یا چھترول' ہم چونکہ ایک امن پسند شہری ہیں اور مستقبل قریب میں اپنے گھر سے چرس' ہیروئین یا کلاشنکوف کی برآمدگی سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ پنجاب پولیس کی رائے سے اتفاق کرنا پسند کریں گے' ذاکر حسین تو ویسے بھی آخری دموں پر ہے۔ اپنڈکس سے نہ مرا۔ ہرنیا سے چل بسا۔ ہرنیا سے بچ نکلا تو چھترول سے جاں بحق ہو گیا۔ اس بہانے ہماری پولیس نے چالیس روپے کی خطیر رقم کی چوری کا مسئلہ تو حل کر دیا۔

پولیس کا ہے فرض مدد آپ کی

ہاورڈ کلاس فیلوز کے ہمراہ

انکار سے انتخاب

○

شہزادی کا المیہ

محل کے نیچے
ہجومِ عشاق منتظر ہے
کہ خواب گہ کا حریری پردہ ذرا ہٹے تو
سب اپنے اپنے شناخت نامے ہوا میں لہرائیں
اور یہ کہنے کا موقع پائیں
کہ عَلیا حضرت !
ہمیں بھی پہچانیے
کہ ہم نے
خزاں کی رُت میں
سیاہ اپریل کے اوائل میں
شام بے وارثی اترنے کی ساعت بے لحاظ میں
دُردانِ عالی جناب کو چادرِ عزا نذر کی تھی
جن کے کناروں پر تارِ خوں سے اب تک
ہمارے ناموں کے حرف اوّل کشیدہ ہوں گے
جو خامشی سے کُھلے سروں اور ننگے قدموں سے
پارۂ نان و جرعۂ آب لے کے
اُس شام سمتِ مقتل گئی تھیں
وہ عورتیں ہمارے نکاح میں تھیں
سوادِ شہرِ صبا میں
خوشبو کی واپسی کے لئے

وہ ہم تھے
جو مثلِ خاشاک دربدر تھے
شمالی یورپ کے دُور افتادہ یخ کدے میں
تمام تر مرکزی نظامِ حرارت و نور و نغمگی میں
وہ ہم تھے جو
سخت اجنبیت کی برفباری میں جل رہے تھے
اور اپنے گھر بار، اپنی املاک، اپنے پیشوں سے دُور ہو کر
نئے وسیلوں سے رزق کی دوڑ میں تھے شامل
خمیری روٹی کی یاد میں
سینڈوچ پہ کرتے رہے گزارا
(یہ کارِ غالیچہ و جواہر تو صرف فرصت کا مشغلہ تھے)
جو لوگ گمنام و سادہ دل تھے
سرشتِ موسم نہیں سمجھتے تھے
اور پیچھے وطن میں رہ کر

ہمارے حصے کے دن
عقوبت کدوں میں تنہا گزارتے
اور ہمارے حصے کے کوڑے بھی
نوشِ جان کرنے میں منہمک تھے
(شراکتِ کار بھی تو کوئی اصول ٹھہرا)
مُباح ہو گا کہ ان کی قربانیوں کا بھی کچھ حساب ہو جائے
اور عطا ہو

انہیں بھی

دینارِ سرخ و رزبوارِ مُشک رنگ و اراضیٔ سبزہ آفرین و

کلاہِ زرتار و خلعتِ کارچوب و دوشالہ

شاہ طوسی!

جہاں پنہ!

یہ تو دیکھیے

آپ کے لئے

ترک ہم نے کیا کچھ کیا ہے، اب تک

کہیں ترقی کا ایک زینہ

کہیں عنایاتِ خسروی کا کوئی رسید

کہیں کوئی منفعت اثر رشتۂ سیاست

کہیں کوئی سیم رنگ شملہ

کہیں کوئی زرنگار طرّہ

اور ان سے بڑھ کر

وطن کی خوشبو، وطن کی گرمی!

ہمارے ایثار کے تناسب سے

اب صلے کی نوید پہنچے

کسی دیارِ غزال چشماں و گل عذاراں میں ہم کو تفویض ہو سفارت

مناصبِ مال و فصل و املاک کی وزارت

نہیں تو بابِ مشاورت ہی کھُلے کسی پر

جو یہ نہیں تو

کسی علاقے کی صوبہ داری

کسی ریاست میں منصبِ چار دہ ہزاری

بکارِ خاص افسروں کی لمبی قطار ہی میں کوئی جگہ دیں

ہمیں صلہ دیں!

کسی طرح قربِ تاج و دربار کی فضیلت ہمیں عطا ہو

حضورؐ کی بارگاہِ جود و سخا میں

حاضر جو ہونا چاہیں

تو کوئی درباں ہمیں نہ روکے

تو کوئی حاجب، مقربِ خاص تک نہ ٹوکے

غلام گردش میں مثلِ موجِ صبا گزرنے کی ہو اجازت

یہ کیا کہ

ہم سے بہت کہیں بعد آنے والے تو آج رتھ پہ اڑے پھریں

اور ہم فقط گردِ راہ دیکھیں:

ہمیں صلہ دیں:

عیاشیوں اور غرضیوں کے طوفان بے پناہ میں

گھری ہوئی ایک شاہزادی

کبھی کبھی سوچتی تو ہوگی

کہ اپنی چھوٹی سی سلطنت کو

جو پہلے ہی دشمنوں کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹک رہی ہے،

خود اپنی پیاری سپاہ سے کس طرح بچائے!

○

سج گئی بزمِ رنگ و نور ایک نگاہ کے لئے
بام پہ کوئی آگیا زینتِ ماہ کے لئے

فرشِ فلک پہ پاؤں رکھ، دیکھ تو کس طرح سے ہیں
تارے بچھے ہوئے تری چشمِ سیاہ کے لئے

دل میں یقینِ صبح کی لَو جو ذرا بلند ہو؛
کافی ہے ایک ہی دیا شبِ سیاہ کے لئے

ہم میں وہ لوگ بھی ہیں جو اے مرے شہر یارِ حسن
آئے نہیں تری طرف منصب و جاہ کے لئے

میری پھٹی ہوئی ردا دے بھی گئی بیاں مگر
فیصلہ رُک گیا ہے ایک اور گواہ کے لئے

کیا ہوا گر نہیں نصیب میرے لباس کو رفو
طرۂ زرفشاں تو ہے تیری کلاہ کے لئے

ہم بھی عجیب لوگ ہیں یا تو بہار گر ہیں یا
سارا چمن جلا دیا اک پرِ کاہ کے لئے

ایک سہانی صبح کو شہر جلا ہوا ملا
ہوتی رہیں حفاظتیں ظلِّ الٰہ کے لئے

سائے جہاں سے کٹ گئے، کتنے اکیلے رہ گئے
کس نے کہا تھا عمر بھر غم سے نباہ کے لئے

ایک اُداس نظم

یہ حسین شام اپنی
ابھی جس میں گھل رہی ہے
ترے پیرہن کی خوشبو
ابھی جس میں کھل رہے ہیں
مرے خواب کے شگوفے
ذرا دیر کا ہے منظر!

ذرا دیر میں اُفق پہ
کھلے گا کوئی ستارہ
تری سمت دیکھ کر وہ
کرے گا کوئی اشارہ
ترے دل کو آئے گا پھر
کسی یاد کا بلاوا
کوئی قصۂ جدائی

کوئی کارِ نامکمل
کوئی خواب ناشگفتہ
کوئی بات کہنے والی
کسی اور آدمی سے!

ہمیں چاہیئے تھا ملنا
کسی عہدِ مہرباں میں
کسی خواب کے یقیں میں
کسی اور آسماں پر
کسی اور سرزمیں پر!

فیضؔ کے فراق میں

تہہِ خاک

کیسا چراغ وقت نے رکھ دیا

کہ سیاہ پوش جنوں ہوا،

کفِ دستِ بادِ صبا سے پھول یہ کیا گرا

چمن نگاہ میں اب بہار کہیں نہیں

ہمہ شہر راہ میں اور نگار کہیں نہیں

پلِ سبز پر کوئی نجمِ راہ فروز اب نہیں خیمہ کش

وہ غبار اُٹھا ہے کہ سوجھتا نہیں راستہ

مرے ماہتاب کہاں ہے تُو

کوئی اور بھی ہے نظامِ مہر و نجوم جس کو رواں ہے تُو

ترے فرشِ نیلوفری پہ کون سے برج کی یہ کشش بڑھی

کہ طلسم خانۂ ہست میں تری روشنی کا قیام اتنا گھٹا گیا

مرے نَے نواز

قبائے ساز ترے فراق میں چاک ہے

وہ سکوت شہرِ سخن میں ہے

کہ صدائے گریۂ شبنمِ شبِ تار دل کو سنائی دے

تہہِ ہفت حجلۂ نور ایک ہی خواب ہے

کوئی معجزہ ہو کہ شکل تیری دکھائی دے !

کوئی سلسلہ ہو کہ راہ پھر سے سجھائی دے !

○

بابِ حیرت سے مجھے اِذنِ سفر ہونے کو ہے

تہنیت اے دل کہ اب دیوار دَر ہونے کو ہے

کھول دیں زنجیرِ دَر اور حوض کو خالی کریں

زندگی کے باغ میں اب سہ پہر ہونے کو ہے

موت کی آہٹ سنائی دے رہی ہے دل میں کیوں

کیا محبت سے بہت خالی یہ گھر ہونے کو ہے

گرد رہ بن کر کوئی حاصل سفر کا ہو گیا

خاک میں مل کر کوئی لعل و گہر ہونے کو ہے

اک چمک سی تو نظر آئی ہے اپنی خاک میں

مجھ پہ بھی شاید توجہ کی نظر ہونے کو ہے

گمشدہ بستی مسافر لوٹ کر آتے نہیں

معجزہ ایسا مگر بارِ دگر ہونے کو ہے

رونقِ بازار و محفل کم نہیں ہے آج بھی :

سانحہ اس شہر میں کوئی مگر ہونے کو ہے

گھر کا سارا راستہ اس سرخوشی میں کٹ گیا

اس سے اگلے موڑ کوئی ہمسفر ہونے کو ہے

سندھو دریا کی محبت میں ایک نظم

ہریالی دریا کے دونوں جانب ہوتی ہے
وہ پہاڑوں اور میدانوں میں بہتے ہوئے
پتھروں اور پھولوں سے یکساں سلوک کرتا ہے
مچھلیاں پکڑتے ہوئے
کبھی کسی مچھیرے سے اس کا ڈومی سائل نہیں مانگتا
بلکہ شکریے کا انتظار کئے بغیر آگے بڑھ جاتا ہے
ہوا اور بادل کی طرح مہربان اور بے نیاز
مگر جب اُس کے کناروں پر رہنے والے
اُس کے پانیوں میں نفرتیں ملانے لگیں
اور بچوں اور پھولوں کو
زالیوں اور مالیوں کا شجرہ دیکھ کر
پانی کا پرمٹ جاری کرنے لگیں
اور یہ سلسلہ بہت دیر تک چلتا رہے
تو تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے
کہ ایسے موقعوں پر
دریا اپنا جغرافیہ تبدیل کر لیتے ہیں !

میرا خیال ہے
ہمارے لئے
فی الحال ایک موہن جو ڈارو کافی ہے !

○

تہ نشیں پر چاند اُترا ، اِک پُرانی یاد کا
دل میں پرچم سا کھُلا کس قریۂ برباد کا

شہر پر اِس ساعتِ نا سعد کا سایہ ہے اب
بھٹنے کے وقت کیوں پتھر رکھا بنیاد کا

بستیوں کی گونج پُر اَسرار سی ہونے لگی
جیسے سناٹا پکارے شہرِ نا آباد کا

چہرہ کہسار کا دھُلا گیا اِک اور رنگ
آئینے بھر کے لئے دیدار برق و رعد کا

ایک ان دیکھی خوشی رقصاں ہے برگ و بار میں
باغِ ہستی میں مرے موسم ہے ابر و باد کا

میں تو اُڑنا بھول جاؤں زندگی بھر کے لئے
بھر گیا ہے دل مگر مجھ سے مرے صیاد کا

ٹماٹو کیچپ

ہمارے ہاں
شعر کہنے والی عورت کا شمار عجائبات میں ہوتا ہے
ہر مرد خود کو اُس کا مخاطب سمجھتا ہے
اور چونکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا
اِس لئے اُس کا دشمن ہو جاتا ہے!

سارؔا نے ان معنوں میں
دشمن کم بنائے
اس لئے کہ وہ وضاحتیں دینے میں
یقین نہیں رکھتی تھی
وہ ادیب کی جورو بننے سے قبل ہی
سب کی بھابھی بن چکی تھی
ایک سے ایک گئے گذرے لکھنے والے کا دعویٰ تھا
کہ وُہ اُس کے ساتھ سو چکی ہے
صبح سے شام تک
شہر بھر کے بے روزگار ادیب
اس پر بھنبھناتے رہتے
جو کام کاج سے لگے ہوئے تھے
وہ بھی
سڑی بُسی فائلوں اور بوسیدہ بیویوں سے اُوب کر
ادھر ہی آتے
(بجلی کے بل، بچے کی فیس اور بیوی کی دوا سے بے نیاز ہو کر
اس لئے کہ یہ مسائل
چھوٹے لوگوں کے سوچنے کے ہیں)
سارا دن
ساری شام
اور رات کے کچھ حصے تک
اَدب اور فلسفے پر دھواں دھار گفتگو ہوتی
بھوک لگتی تو
چندہ ونده کر کے
نکڑ کے ہوٹل سے روٹی چھولے آ جاتے
عظیم دانشور
اُس سے چائے کی فرمائش کرتے ہوئے کہتے
تم پاکستان کی امرتا پریتم ہو
بے وقوف لڑکی
سچ سمجھ لیتی
شاید اس لئے بھی
کہ اُس کے نان و نفقہ کے ذمہ دار تو اسے ہمیشہ
کاذکا کی کافی پلاتے
اور نروا کے بسکٹ کھلاتے رہتے
اس کا دل میں تھٹے ہوئے COMPLIMENT کے بہانے
اُسے روٹی تو ملتی رہی
لیکن کب تک
ایک نہ ایک دن تو اُسے بھیڑیوں کے چنگل سے نکلنا ہی تھا
سارؔا نے جنگل ہی چھوڑ دیا!
جب تک وہ زندہ رہی
اَدب کے رسیا اسے جھنجھوڑتے رہے
اُن کی محفلوں میں اُس کا نام
اب بھی لذیذ سمجھا جاتا ہے
بس یہ کہ اب وُہ اس پر دانت نہیں گاڑ سکتے
مرنے کے بعد انہوں نے اسے
ٹماٹو کیچپ کا درجہ دے دیا ہے!

نذرِ سارا شگفتہ

اپنے بیٹے کیلئے ایک نظم

مرے بچّے نے پہلی بار اٹھایا ہے قلم
اور پُوچھتا ہے
کیا لکھوں ماما؟

میں تجھ سے کیا کہوں بیٹے
کہ اب سے برسوں پہلے
یہ لمحہ جب مری ہستی میں آیا تھا
تو میرے باپ نے مجھ کو سکھائے تھے
محبت، نیکی اور سچائی کے کلمے
مرے توشے میں ان لفظوں کی روٹی رکھ کے وہ سمجھا تھا
میرا راستہ کٹ جائیگا
آگے سفر آسان ہو جائے گا شاید!

محبت مجھ سے دُنیا نے وصُول
قرض کی مانند
نیکی سُود کی صُورت میں
حاصل کی
مری سچائی کے سِکّے
ہُوئے رد اس طرح سے
کہ میں فوراً سنبھلنے کی نہ گر تدبیر کرتی
تو سر پہ چھت نہ رہتی
تن پہ پیراہن نہیں بچتا
میں اپنے گھر میں رہ کر

عُمر بھر جزیہ ادا کرتی رہی ہوں!

زمانہ
میرے خدشوں سے سوا عیار تھا
اور زندگی
میری توقع سے زیادہ بے مروّت تھی
تعلق کے گھنے جنگل میں
بچھو سرسراتے تھے
مگر ہم اس کو سرشاری میں
فصلِ گُل کی سرگوشی سمجھتے تھے
پتہ ہی کچھ نہ چلتا تھا
کہ خوابوں کی چھپر کھٹ پر
لباسِ ریشمیں
کس وقت بن کر کینچلی اترا
مخاطب کے دو پہلے دانت
کب لمبے ہوئے
اور کان
کب پیچھے مُڑے
اور پاؤں
کب غائب ہُوئے یکدم!

میں اس کذب و ریا
اس بے لحاظی سے بھری دُنیا میں رہ کر
محبت اور نیکی اور سچائی کا ورثہ
تجھ کو کیسے منتقل کر دوں
مجھے کیا لے دیا اُس نے !

مگر میں ماں ہوں
اور اک ماں اگر مایوس ہو جائے
تو دُنیا ختم ہو جائے
سو میرے خوش گماں بچے !
تو اپنی لوحِ آئندہ پہ
سارے خوبصورت لفظ لکھنا
سدا سچ بولنا
احسان کرنا
پیار بھی کرنا
مگر آنکھیں کھلی رکھنا !

O

دِل کو مہر و مہ و انجم کے قریں رکھنا ہے
اِس مسافر کو مگر خاک نشیں رکھنا ہے

سہہ لیا بوجھ بہت کوزہ و چوب و گِل کا
اب یہ اسبابِ سفر ہم کو کہیں رکھنا ہے

ایک سیلاب سے ٹوٹا ہے ابھی ظلم کا بند
ایک طوفاں کو ابھی زیرِ زمیں رکھنا ہے

رات ہر چند کہ سازش کی طرح ہے گہری
صبح ہونے کا مگر دل میں یقیں رکھنا ہے

درد نے پوری طرح کی نہیں تہذیب اس کی
ابھی اِس دل کو ترا حلقہ نشیں رکھنا ہے

حرفِ تحسین

جدید شاعری کا منظر نامہ پروین شاکر کے دستخط کے بغیر نامکمل ہے۔

(ڈاکٹر گوپی چند نارنگ)

پروین شاکر جدید اردو شاعری کے مقبول ترین ناموں کی فہرست میں اپنے لئے جگہ بنا چکی ہیں پروین کے کلام میں جذبوں کی سچائیوں کے ساتھ پیدا ہونے والی لازمی شکست و ریخت پر گریہ کی بجائے لطیف طنز کی عمل داری ہے انہوں نے اس خاص پیچیدہ صورت حال کو شاعری بنایا ہے پروین شکست ذات کی اولین منزلوں سے گزر چکنے کے بعد ایک ایسے دور میں داخل ہو چکی ہیں جہاں ذاتی اور غیر ذاتی محسوسات بھی محض زاویہ نگاہ اور اسلوب کا معاملہ بن جاتے ہیں زیادہ بہتر اور گہرا اظہار تجربہ کی معنویت اور اطلاعات کی تعمیم کرتا ہے پروین کی شاعری میں سانپ بن کر ڈسنے والی تنہائی اور احتجاجی بلند حوصلگی کی خواہشوں کے لئے علیحدہ علیحدہ خانے نہیں ہیں جو کچھ ہے اور جیسا ہے کفایت لفظی کے ساتھ سپرد قلم کر دیا جاتا ہے۔ لیکن کچھ اس طرح کہ زندگی پر پیار آجاتا ہے پروین شاکر کم عمری ہی میں رجحان ساز شاعرہ کا روپ دھارتی نظر آتی ہیں اور یہ بذات خود قابل مبارک باد کامیابی ہے۔

(محمد علی صدیقی)

جدید طرز فکر رکھنے والی ممتاز شاعرہ پروین شاکر عہد حاضر کی بڑی ذمہ دار شخصیت ہے اس کے ہاں پختہ کاری کے علاوہ پر کاری بھی بدرجہ وافر پائی جاتی ہے اس نے لفظ و حرف سے جو پیکر جمیل تراشے ہیں وہ اسراف اور ذہنی تعیش کی تہمت سے مبرا و منزہ ہیں۔

(رضا ہمدانی)

پروین شاکر کا شمار ان چند شاعرات میں ہوتا ہے جنہوں نے نہایت کم عرصے میں ادب میں نہ صرف اپنا اعتبار قائم کیا ہے بلکہ وہ ادا جعفری کے بعد دوسری شاعرہ ہے جس نے شہرت و مقبولیت کے لحاظ سے وہ مقام حاصل کر لیا ہے جو ہماری اردو شاعری میں بہت کم شاعرات کو حاصل ہوا ہے۔

پروین شاکر کا شعری گراف مسلسل ارتقاء پزیر ہے۔ اور اس کی شاعری نازک جذبات اور لطیف احساسات کی راہ سے ہوتی ہوئی شعور و فکر کے اعلی مدارج کی طرف گامزن ہے۔

محسن بھوپالی

پروین شاکر کی خوبصورت فکر، انفرادیت اور شعری رویے بلاشبہ اس کی شہرت بڑھانے کا باعث ہیں لیکن اس کے علاوہ اس کی غزل میں بھی بڑا جادو ہے اور اسے غزل کی ایک بڑی شاعرہ ہونے سے کوئی انکار نہیں کر سکتا جس کا ثبوت یہ ہے کہ ملک کے تمام چوٹی کے نقاد حضرات نے اپنے دور کی بڑی شاعرہ تسلیم کیا ہے اور اس کا لوہا مانا ہے۔

(فارغ بخاری)

پروین شاکر کے کلام کو پڑھ کر مجھے ہمیشہ تازہ ہوا میں سانس لینے کا احساس ہونے لگتا ہے اس نے اردو شاعری کو ایک نئے اسلوب اور خوبصورت جذبے سے روشناس کرایا ہے یہ نیا لہجہ اور دلکش اسلوب اسے آوازوں کے جنگل میں ایک انفرادیت بخشتا ہے۔

(حسن احسان)

پروین شاکر کی کتاب خوشبو پڑھتے وقت مجھے یہ محسوس ہوا کہ خوشبو میں پہلی مرتبہ ایک لیلیٰ صفت لیلیٰ کے جذبات کو زبان شعر نصیب ہوئی ہے لیکن ان جذبات کا تعلق کسی مجنوں صفت مجنوں سے نہیں اردو شاعری کی اس صورت حال نے مجھے جمیل ملک کا وہ شعر یاد دلایا جس کے سہارے ممکن ہے وہ ہمیشہ زندہ رہ سکیں۔

پیچ در پیچ سلسلہ دل کا
مجھے تیری تجھے کسی کی تلاش ہے

(نظیر صدیقی)

خوشبو پڑھتے ہوئے مجھے بارہا احساس ہوا کہ پروین نے اپنی شاعری میں جس جذباتی دور کی نمائندگی کی ہے اس میں اس نے اظہار کا حق ادا کر دیا ہے۔

(سیدہ حنا)

پروین شاکر کو جدید اردو شاعری میں ایک نمایاں اور منفرد مقام حاصل ہے اس نے یہ نمایاں مقام برسوں کے عمیق مطالعہ زندگی کے گہرے مشاہدے اور فنی تپسیا کے بعد حاصل کیا ہے۔

(لطیف کاشمیری)

پروین شاکر کی شاعری میں گل صد برگ کی خوشبو محبت و صداقت کا نام ہے اور ہوا شباب و شعور کا وہ تازیانہ ہے جو اس کے اندر سوئی ہوئی تمام حسیات کو جگا کر اسے آئینہ چمن کے مقابل لا کھڑا کرتا ہے۔

(جمیل ملک)

ادب کا تقاضا شاعرہ پروین سے یہ ہے کہ وہ اسی طرح اپنی سوچ اپنی فکر اور اپنے زرخیز ذہن سے خوبصورت کلام تخلیق کرتی رہیں اور ادب کا دامن اپنی ہی طرح دل پذیر موتیوں سے بھرتی رہیں۔

(یوسف رجا چشتی)

پروین شاکر اردو شاعری میں ایک معتبر نام ہے وہ صرف پاکستان ہی کی نہیں بلکہ پورے برصغیر کی ایسی خوش نصیب شاعرہ ہے جس نے کم عمری ہی میں شہرت کے افق کو چھو لیا اور اپنی شخصیت اور شاعری سے نوجوان ذہنوں کو بے حد متاثر کیا۔

(احمد پراچہ)

سرفراز شاہد کی مزاحیہ شاعری

احمد ندیم قاسمی

مزاح نگاری نہایت دشوار فن ہے۔ اردو میں پھکڑپن تو ریختیوں اور ہجووں وغیرہ کی صورت میں ماضی میں عام رہا ہے مگر معیاری مزاحیہ شاعری کی مثالیں بہت کم بلکہ بہت ہی کم ہیں۔ صرف نظیر اکبر آبادی نے اور بعد میں اکبر الہ آبادی نے مزاحیہ شاعری کو اعتبار بخشا۔ ان بڑے شاعروں کے ہاں بھی مزاح کہیں نہ کہیں اپنی جھلک دکھاجاتا ہے جن کے مزاج میں شوخی تھی۔ مثلاً غالب جب کہتا ہے کہ:

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے، ذرا میرے پاؤں داب تو دے

تو وہ محض اپنی شوخی اور مزاح کا اظہار کر رہا تھا۔ اقبال تک نے اپنے پہلے اردو مجموعہ کلام میں "اکبر الہ آبادی کے زیر اثر" اپنے ظریفانہ کلام کے لئے الگ حصہ وقف کیا مگر اردو شاعری میں مزاح نگاری نے دورِ رواں میں صحیح معنوں میں عروج پایا۔ سید ضمیر جعفری، سید محمد جعفری، مرزا محمود سرحدی، دلاور فگار اور انور مسعود جیسے بے حد ذہین شعراء کے کمالات فن نے مزاحیہ شاعری کو باقاعدہ ایک الگ صنفِ شاعری کا درجہ عطا کیا اور اب سرفراز شاہد بڑے مزاح نگار شاعروں کی صف میں نہایت اعتماد اور سراسر جائز اعتماد کے ساتھ شامل ہو گیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ سینئر مزاحیہ شاعروں میں سے کسی سے بھی اس حد تک متاثر نہیں کہ اس کا کلام ان شاعروں کے کلام کی کاربن کاپی بن جائے۔ وہ ان سب کا معترف مگر ان سب سے مختلف ہے۔ اس کے ہاں بے تکلفی، بے ساختگی، سادگی، سلاست ہے اور ان عناصر کی یک جائی سے اس کا ایک ایسا اسلوب صورت پذیر ہوا ہے جو الگ سے پہچانا جا سکتا ہے۔

مزاح کے حوالے سے نثر میں پطرس نے خالص مزاح کا جو حیرت انگیز اور دلربا انداز اختیار کیا تھا وہ مزاحیہ شاعری میں بھی در آیا مگر مزاح کا اعلیٰ معیار قائم کرنے والے ان شاعروں کے مزاح میں کہیں نہ کہیں طنز بھی داخل ہو جاتا ہے اور یہ دور حاضر کے حالات وواقعات کے حوالے سے ناگزیر ہے۔ سرفراز شاہد کے ہاں اس خالص مزاح کی ایک مثال:

قابض رہا ہے دل پہ جو سلطان کی طرح
آخر نکل گیا شہِ ایران کی طرح

دیکھ لیجئے کہ اس خالص مزاح کے پہلو میں طنز کی نوک بھی گڑی ہوئی ہے۔ اس نوع کے چند اور اشعار ملاحظہ کیجئے:

لوگ جسے آنکھوں کی مستی کہتے ہیں
ممکن ہے وہ آنکھوں کی بیماری ہو

زخم وہ دل پر لگاتے ہیں مرے، اور اس پہ روز
اپنے گھر سے بھیج دیتے ہیں نمکدانی مجھے

اک خلا باز کی سنیں چیخیں
اس کو رکشے پہ جب سوار کیا

لو اپنا مسیحا بھی ہوا ماہرِ امراض
اب مشورہ دیتا ہے، دوائی نہیں دیتا

یقیناً خالص مزاح کا ایک اپنا منفرد مقام ہے مگر جب مزاح میں طنز شامل ہو جائے تو مزاحیہ شاعری بھی تنقید حیات کا درجہ اختیار کر جاتی ہے۔ جب انسان کھل

کر ہنسے اور ہنستے ہوئے یا ہنسنے کے فوراً بعد ایک گہری سوچ میں ڈوب جائے تو سمجھ لیجیے کہ مزاحیہ شاعر نے ایک کامیاب سرجن کا کام کر دکھایا ہے۔ جب مزاح اور طنز آپس میں معانقہ کرتے ہیں تو اس طرح کے بیک وقت دلربا اور دلدوز اشعار تخلیق پاتے ہیں:

یوں ہی مہنگائی اگر بڑھتی رہی
قوم سادہ خود بخود ہو جائے گی

پسند آئی نہیں ہم کو کبھی تجریدیت فن میں
مگر اک بار جب "تصویرِ الثانی" پسند آئی

سر کو پکڑ کے بیٹھا ہے نقاد کس لیے
میری غزل علامتی افسانہ تو نہیں

جنابِ شیخ نے جنت میں اک ہلچل مچا ڈالی
کبھی حوریں مصیبت میں، کبھی غلمان مشکل میں

سرکاری محکموں کے معیار کارکردگی کے یہ آئینے دیکھیے:

لقمہ حلال کا جو ملا اہل کار کو
اس نے چبا کے تھوک دیا پان کی طرح

آیا ہے سویرے تو کوئی اور ہی ہوگا
افسر تو کبھی وقت پہ دفتر نہیں آتے

افسر اور سرمایہ داری کا یہ جوڑ بھی لائق توجہ ہے:

میں اک چھوٹا سا افسر ہوں، وہ اک موٹا سا مل اونر
مگر دونوں کے انکم گوشوارے ایک جیسے ہیں

مسلمان بھائیوں نے ہمارے ملک میں، بلکہ دنیا بھر میں، اسلامی اخوت اور بھائی چارے کی تذلیل کا جو دردناک سلسلہ شروع کر رکھا ہے، وہ سرفراز شاہد کا موضوعِ خاص ہے۔ ان اشعار میں اس کے لبوں پہ مسکراہٹ کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو بھی دیکھے جا سکتے ہیں:

بارہا آپس میں ٹکراتی ہیں جی ٹی روڈ پر
یہ بسیں اور ویگنیں گویا مسلمان ہو گئیں

لڑا دیتا ہے جو اکثر برادر کو برادر سے
یہ جذبہ جب بھی دیکھا ہے، مسلمانوں میں دیکھا ہے

مسلمانوں کی خواہش ہے کہ وہ سب ایک ہو جائیں
مگر ان کو اکٹھا مولوی ہونے نہیں دیتے

ہم ان دنوں جس معاشرتی آشوب میں سے گزر رہے ہیں، اسے کوئی بھی سنجیدہ یا مزاحیہ شاعر نظرانداز کرے گا تو منافقت کا مظاہرہ کرے گا۔ سرفراز شاہد نے مروجہ معاشرتی معیاروں پر بہت زور کی چوٹیں کی ہیں:

کرتا ہوں طلب جنسِ وفا اہل جہاں سے
یہ چیز تو بھائی کو بھی بھائی نہیں دیتا

ٹھٹن کے موڑ سے آگے نکلنا چاہتے ہیں ہم
مگر وہ چوک کی بتی ہری ہونے نہیں دیتے

مرغ پر فوراً جھپٹ دعوت میں، ورنہ بعد میں
شوربہ اور گردنوں کی بوٹیاں رہ جائیں گی

پرانے دور میں، خاص طور پر جس طرح نثری مزاح کا اہم موضوع بیویاں ہوتی تھیں اسی طرح سرفراز شاہد کو مہمانوں اور مہنگائیوں نے پریشان کر رکھا ہے۔ صرف ایک شعر اس صورت حال کی نمائندگی کے لئے کافی ہے:

مہنگائی کے اس دور میں، مہمان کے ڈر سے
اب گھر کا پتہ حاتم طائی نہیں دیتا

سید ضمیر جعفری، سید محمد جعفری اور انور مسعود نے مشہور شعراء کے بعض شعروں کی نہایت کامیاب پیروڈیاں کی ہیں۔ اس ضمن میں بھی سرفراز شاہد کسی سے پیچھے نہیں۔ اس نے فیض احمد فیض کے ایک مشہور شعر کی یوں پیروڈی کی ہے۔

کہیں اڑ گئے، کہیں لُٹ گئے، کہیں پِٹ گئے، کہیں مٹ گئے
"رہ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا"

یہ ہے ہمارا نہایت تیکھے تیوروں والا سادہ و پرکار سرفراز شاہد جس نے اپنے مزاح میں پھکڑپن اور سوقیانہ پن کو پاس بھٹکنے نہیں دیا اور جسے بابائے مزاح سید ضمیر جعفری کی یہ سند حاصل ہے کہ سرفراز شاہد کی تخلیقات سے مزاحیہ شاعری کی آبرو اور پاکیزگی میں اضافہ ہوا ہے۔

سفرنامہ

بحر اوقیانوس کے اس پار قسط: ۲۱

بہ نعیم جعفری

میرپوری مشاعرہ

یہ علاقہ جزیروں کا ایک جھرمٹ ہے۔ نیو یارک کا شہر، جس میں "مین ہٹن" کا علاقہ جو اس شہر میں لاہور کے "موچی گیٹ" والی دھڑکن رکھتا ہے ----- آس پاس کے جزیروں کے ساتھ سمندر کے اوپر تنے ہوئے عظیم الشان پلوں سے مربوط ہے یہ سمندر کے نیچے بچھی ہوئی سرنگوں میں سے گزرتی ہوئی شاہراہوں کے ذریعے سے۔ ہم نے آج رات نیو یارک میں اپنا پہلا مشاعرہ "سٹیٹن" (Statin) کے جزیرے میں پڑھا۔ نشست کا اہتمام ایک تعلیمی اکاڈمی کے ہال میں کیا گیا۔ سامعین کی تعداد، جن کی تواضع پر تکلف چائے سے کی گئی، تین سو کے لگ بھگ تھی اور ان میں غالب کثرت پاکستانیوں کی تھی۔ اور پھر پاکستانیوں میں آزاد کشمیر کے میرپوری چودھریان اور ملکان کی۔ کیونکہ "انجمن اردو" کے بانی جناب ڈاکٹر عبدالرحمن عبد کا اپنا گاؤں ----- بوعہ ----- بھی منگلا جھیل کے کنارے اسی علاقہ میں واقع ہے۔ یوں سامعین میں ہر دوسرا آدمی ڈاکٹر تھا یا انجینئر۔ ڈاکٹر عبدالرحمن عبد شمالی امریکہ کے پاکستانیوں کی اہم شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ امریکہ میں کشمیر کے حق ارادیت کی جدوجہد کرنے والی مختلف تنظیموں کی فیڈریشن کے صدر ہیں۔ اردو زبان و ادب کے فروغ کی مساعی میں پیش پیش رہتے ہیں۔ ایک سالانہ مشاعرہ تو ان کی اپنی انجمن کے حوالے سے نیو یارک کی ادبی تاریخ کی روایت بن چکا ہے۔ جزیرہ "سٹیٹن" میں ----- مسجد النور کا عظیم دینی مرکز بھی ان کی سرپرستی میں نیو یارک میں مقیم ہر ملک کے مسلمانوں کی روحانی اور دینوی خدمت میں سرگرم عمل ہے۔ علاوہ ازیں آپ امریکہ میں ڈاکٹروں کی سب سے بڑی تنظیم کے بھی منتخب صدر ہیں اور یہ اعزاز اس تنظیم کی ڈیڑھ سو برس کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی ایشیائی کو ملا تھا۔ ڈاکٹر رحمن ایک نثر گو شاعر ہیں اور آج مشاعرے میں ان کی خطابت کے اسلوب سے اندازہ ہوا کہ وہ بہت اچھے خطیب بھی ہیں۔

مشاعرے کے صدر جناب حنیف اخگر تھے اور مہمان خصوصی جناب محشر بدایونی۔ نظامت معروف شاعرہ فرحت زاہد نے کی جو مشہور شاعر زاہد سعید کی رفیقہ حیات ہیں۔ یہ دونوں میاں بیوی ----- اردو میں نئے لہجے کی غزل میں بڑی تیزی سے اپنی شناخت پیدا کر رہے ہیں۔ فرحت زاہد نے اپنے تلے تبصروں اور لطیف و بلیغ برجستہ جملوں سے محفل کی تہذیبی فضا کو بڑے ہی سلیقے سے آخر تک برقرار رکھا۔ اور اس کیفیت میں کہ وہ ایک کان سے شاعر کا شعر سنتی اور دوسرا کان اپنی بچی کی آواز پر لگا رہتا جو باپ کی گود میں سے ماں کی گود کو آوازیں دے رہی تھی۔ جناب محشر اور جناب سرشار کو بار بار دعوت سخن دی گئی۔ مقامی شعراء میں سرفہرست جناب مامون ایمن تھے جو امریکہ میں اردو ادب کے قدیم ترین "آباد کاروں" میں سے ہیں اور اردو غزل کے حوالے سے جن کا نام ایک بڑا معتبر نام ہے۔ جناب عزیز الحق عزیز جناب انوار قادری اور نوجوان شاعر رئیس وارثی کے کلام کی دل آویزی نے سامعین سے خوب خوب داد سمیٹی۔ حمیرا رحمان اور فرحت زاہد ان دونوں نے تو اپنے انوکھے جداگانہ اسلوب میں مشاعرے کو گویا لوٹ ہی لیا۔ رئیس وارثی کو ہم نے اسلام آباد میں ایک طالب علم کی حیثیت سے دیکھنے کے بعد یہاں پہلی مرتبہ شاعر کی حیثیت سے دیکھا اور ادبی حلقوں میں ان کی مقبولیت پر دل بہت خوش ہوا۔ نیو یارک میں ان کی کاوشوں سے لندن کے "اردو مرکز" کی نہج پر --- ایک اسی نام سے ایک مرکز قائم ہو چکا ہے جس میں کتابیں بھی ہیں اور کتابوں کی باتیں بھی کی جاتی ہیں۔ عزیز الحق عزیز کا مجموعہ کلام حال ہی میں منظر عام پر آیا تھا۔ ابھی چند دن پہلے نیو یارک میں ان کی کتاب کی تعارفی تقریب منعقد ہوئی تھی۔ جس کی صدارت کے لیے پاکستان کے ممتاز نقاد اور دانشور ڈاکٹر فرمان فتح پوری خاص طور پر کراچی سے تشریف لائے تھے۔ ایک خوبصورت اور ہنس مکھ جواں سال پٹھان شاعر ڈاکٹر شفیق الرحمن کی ملی جلی اردو پشتو شاعری نے بھی لوگوں کو خوب ہلایا جلایا۔ انکی "خیبر یونین" کی طرف سے جس کے وہ صدر ہیں سال کے سال ایک مشاعرہ بھی نیو یارک میں منعقد ہوتا ہے۔ مشاعرے میں کراچی کے جناب یسین مراد آبادی سے بھی ملاقات ہو گئی جو جناب قتیل شفائی کے پرستاروں اور اس حوالے سے ہمارے بھی یاروں میں سے ہیں۔ وہ نیو جرسی میں اپنے بیٹے کے پاس آئے ہوئے تھے، جس طرح ہم ڈینور میں اپنے بیٹے کے پاس۔ ہمیں تو کچھ یوں لگ رہا ہے کہ امریکہ میں جتنے پاکستانی بیٹے مقیم ہیں اتنے ہی باپ بھی یہاں موجود ہیں۔

مشاعرہ رات کے تین بجے ختم ہوا۔ سڑکیں دن ہی کی طرح "چل" رہی تھیں۔ غالباً نیو یارک کی "صبح" چل پڑی تھی ----- ہاں! آج کے مشاعرے میں ہم نے جناب محشر بدایونی کو پہلی مرتبہ ترنم سے کلام سناتے سنا اور ان کا

ترنم اتنا دلکش تھا کہ ہم واپسی پر موٹر میں بھی ان سے ترنم کی فرمائش کرتے رہے۔ (15 نومبر)

امریکہ کے لاہور

نومبر کی شام کو بوسٹن میں مشاعرہ تھا۔ دعوت پاکستان ایسوسی ایشن کی طرف سے تھی۔ بوسٹن نیویارک سے تقریباً دو سو میل کے فاصلے پر ہے جیسے راولپنڈی سے لاہور۔ ہم لوگ چار گھنٹے میں پہنچ گئے۔ رفتار پر پابندی ہے ورنہ کشادہ اور ہموار شاہراہوں پر موٹریں اڑتی چلی جائیں۔ کچھ دیر ہم راستے میں دوپہر کے کھانے کے لیے ایک ریستوران میں ٹھہرے بھی۔ موٹروں کا مسلسل سیلاب کہیں ٹوٹنے نہ پایا۔ منظر اور ماحول کی خوبصورتی میں بھی کوئی کھردرا رخنہ کہیں دیکھنے میں نہ آیا۔ جھومتے شاخساروں سے بھرا ہوا ایک سرسبز میدان ------ دونوں طرف ------ ساتھ ساتھ بچھتا چلا گیا۔ پہاڑیوں کے سلسلے میں بھی وادیاں اور آبادیاں ------ شہزادیوں کی طرح جھانکنے لگتیں۔

ہمارا کارواں دو موٹروں پر رواں تھا۔ حمیرا۔ محشر اور سرشار ------ نسیم الرحمن صاحب کی موٹر میں تھے۔ زاہد سعید کی لمبی چوڑی ------ "لینڈ کروزر" ------ میں اگلی نشست پر زاہد کے ساتھ ہم تھے اور عقبی حصے میں ------ قالین کے فرش پر (کہ سیٹیں نکال دی گئی تھیں) فرحت اپنے بچوں ------ عثمان، فیضان اور تعبیر ------ اور حمیرا کے بچوں انعام و دعا کو پھلوں اور مٹھائیوں سے بھری ہوئی ٹوکریوں کے ساتھ ------ لے بیٹھی تھی۔ راستے میں پھل اور مٹھائی بھی کھاتے آئے اور اشعار بھی سنتے سناتے آئے۔ ان دونوں کے شعر کی تازگی، خیال انگیزی، اور آشوب عصر کی آنچ نے بہت متاثر کیا۔ چولستان کے تعلق سے ان کی شاعری میں ریگستان کی چاندنی راتوں میں جاگتی کھجوروں کے جھنڈ سانس لیتے سنائی دیتے ہیں۔ ان کی شاعری زندگی کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ حمیرا کی طرح ------ ان کا شعر بھی اپنا رنگ آہنگ رکھتا ہے۔ یہ نہیں کہ لفظوں کو ------ غالب اور اقبال کی "واشنگ مشین" میں ڈال کر نکال لیں۔ آسمان پر بادل بھی تھے۔ مگر ہم شاعری کے بس پیروں پر بادلوں سے بھی اوپر اڑتے رہے ------ راستے کا ریستوران ------ جہاں کھانا کھایا ------ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ لوگ بھی رنگا رنگ اور کھانے بھی رنگا رنگ۔ ایک میاں بیوی (یا محض مرد عورت) نے دو طوطوں کو بھی شریک طعام کر رکھا تھا۔

راستے میں اس قصبے سے بھی گزرے جہاں اردو کی منفرد شاعرہ محترمہ پروین شاکر ایک یونیورسٹی میں "پی ایچ ڈی" کر رہی تھیں۔ مگر وہ اس انتقال سے مشاعروں میں شرکت نہیں کرتیں کہ مشاعرہ آگے نکل جائے گا اور "تعلیم" ------ پیچھے رہ جائے گی۔

بوسٹن میں ہمارا قیام شہر کے "نیویارکی حاشیے" پر ایک نہایت آرام دہ "موٹل" میں تھا۔ یہ "موٹل" ------ موٹلوں کے ایک "عالمی خاندان" کا "چشم و چراغ" تھا۔ جس طرح امریکہ کی سیاست ساری دنیا پر چھائی ہوئی ہے۔ اسی طرح اس کے "موٹل" بھی دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ پاکستان ایسوسی ایشن کے سیکرٹری جناب ڈاکٹر جناب صدیق عبداللہ موٹل پر ہمارے منتظر تھے۔ (امریکہ میں ایسوسی ایشن کا معتمد صرف سیکرٹری ہی کہلاتا ہے ------ "سیکرٹری جنرل" نہیں کہلاتا۔ ہمارے ہاں سیکرٹری کے ساتھ "جنرل" کا رواج غالباً ملک میں جرنیلی بندوبستوں کے زمانے میں ہوا) موٹل میں کچھ وقت میں ستانے کا مل گیا۔ ہم نے اس خداداد مہلت میں ازراہ احتیاط اپنے زریں لنگوٹ کو بدل کر باندھ لیا۔ رات کا کھانا ایسوسی ایشن کے صدر جناب ڈاکٹر محمد سعید کے دولت کدے پر تھا۔ پہاڑی پر واقع عالی شان بنگلے میں مہمانوں کا جم غفیر ہمارے خیر مقدم میں جمع تھا۔ یہاں بھی ہر دوسرا شخص ڈاکٹر، انجینئر، سائنس دان یا اقتصادی ماہر۔ ڈاکٹر اور بیگم سعید ------ کا تعلق فیصل آباد سے ہے۔ فیصل آباد کی نسبت ہم نے ان سے (معروف ادیب) جناب منظور الٰہی (سابق سیکرٹری تعلیمات حکومت پاکستان) اور ان کے بڑے بھائی کرنل مقبول الٰہی درویش کا تذکرہ کیا تو وہ ان کے آشناؤں میں سے نکلے۔ کھانے میں بھی فیصل آباد کا زرعی مزاج کار فرما دیکھا۔ متنوع، پرشکوہ اور خوش ذائقہ پاکستانی ضیافت کی نعمتیں میزوں کے ایک طویل سلسلے پر انتہائی قرینے کے ساتھ آراستہ تھیں۔ یہاں جناب سید ضمیر الحسن صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے یاد دلایا تو یاد آیا کہ اس نام کا ایک خوش لڑکا جب گورنمنٹ کالج اصغر مال راولپنڈی کا طالب علم تھا تو گوال منڈی میں بزرگ دوست اور قادر الکلام شاعر جناب ظہور الحسن رزمی صدیقی مرحوم کے "فن کدہ" (گھر کا نام) پر ملا کرتا تھا۔ ضمیر صاحب اب کینیڈا میں ہوتے ہیں اور رزمی صاحب کے شگفتہ تمکین لہجے میں شاعری بھی کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ "فن کدہ" میں نذیر احمد شیخ، عبدالعزیز فطرت کی روزانہ کی "شام گشت" کی یاد تازہ ہوتی رہی۔ جس کی ابتدا رزمی صاحب کے گھر میں چائے سے ہوا کرتی جو عموماً رزمی صاحب کے بیٹے اظہر میاں اور (شاگرد رشید) ضمیر میاں مل کر اٹھا لاکرتے۔

مشاعرہ کی نشست ------ شہرہ آفاق ------ "ایم آئی ٹی" یونیورسٹی کی ایک سماعت گاہ میں ------ سفید چاندنیوں کے فرش پر رنگین ریشمی جم

جھماتے ہوئے گاؤ تکیوں سے روایتی اسلوب میں آراستہ کی گئی تھی۔ جو امریکی بالخصوص جاپانی طلباء کو اتنا پسند آیا کہ پہلی چند قطاروں میں "جاپانی سامعین" ہی بھرے ہوئے تھے۔ دل را بہ دل رہیست۔ وہ بھی مشرقی ہم بھی مشرقی۔ سامعین کی تعداد تین سو سے زیادہ ہوگی کم نہ تھی۔ اسی طرح خواتین کی تعداد ---- مردوں سے زیادہ ہوگی، کم نہ تھی۔ پاکستانی خواتین و حضرات ------ قومی لباس زیب تن کر کے آئے تھے۔ غراروں اور ساڑھیوں کی کہکشاں کے لہلہاتے ہوئے رنگوں کی بہار دیدنی تھی۔ طلباء بھی جو یہاں عموماً تنگ "جین" میں ملبوس (بلکہ محبوس" رہتے ہیں، آج شلوار قمیض ---- واسکٹوں اور شیروانیوں میں ملبوس تھے۔ مشاعرے پر ایک قوم کے حوالے سے 'اپنا تہذیبی و تمدنی رکھ رکھاؤ غالب تھا۔

اردو کے جواں سال و جواں فکر ---- اسلوب جدید کے نمائندہ شاعر (اور ایک زمانہ میں حلقہ ارباب ذوق کراچی کے ہنگامہ آفریں سیکرٹری) جناب سرور اقبال سے بھی اس تقریب میں ملاقات ہو گئی۔ سرور اقبال صاحب کراچی کے قیام کے زمانے میں (ہمارے محترم دوست اور یکے از بزرگان حلقہ ارباب ذوق) جناب ضیا جالندھری کے "لیفٹیننٹ" بلکہ "کمانڈو" ہوا کرتے تھے۔ سو دیر تک ان کی باتیں کرتے رہے۔ ہم نے بتایا کہ ضیا صاحب کے سر کے بال جتنے سفید ہوتے جا رہے ہیں، ان کی شاعری اتنی ہی جوان ہوتی جا رہی ہے۔ وہ ان چند اعلیٰ سرکاری افسروں میں سے ہیں (بلکہ شاید واحد شاعر ہیں) جو "کرسی" کے بغیر بھی اپنے مقام پر قائم ہیں۔ سرور اقبال کو بوسٹن آئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا، لہٰذا وہ انتظامات کے "اندر" نہیں تھا۔ مگر طبعاً زیادہ دیر تک "باہر" بھی نہ رہ سکتا تھا۔ چنانچہ اپنی باری پر پہلے تو اس نے اپنی گرم گفتاری سے مشاعرے کو "ہلایا جلایا" اور پھر مشاعرے کی نظامت کو خود بخود آگے بڑھ کر اس طرح سنبھال لیا جس طرح فیلڈ مارشل ایوب خان نے ملک کا اقتدار سنبھال لیا تھا۔ بوسٹن کو اپنی شہرہ آفاق جامعات کے عظیم جھرمٹ کے باعث امریکہ کا لاہور کہنا غلط نہ ہوگا۔ پاکستانی طلباء ہی کی تعداد تین ہزار سے اوپر بتائی جاتی ہے۔ سرور اقبال نے اپنے کمال نظامت سے اس "بیگانے مشاعرے" کو اردو اور انگریزی میں کچھ اس طرح "اپنائے اور جگائے" رکھا کہ "بوسٹن" کو "لاہور" بنا دیا۔ شاعر ایک منٹ پڑھتا اور سرور اقبال اس کے اسلوب سخن کے مختلف سائیوں کو پانچ پانچ منٹ تک چھانتا سانتا رہتا۔ شعراء کی تعداد نیویارک ہی کے مہمانوں پر مشتمل تھی۔ کچھ ساتھ سرور اقبال اور کینیڈا کے ضمیر صاحب نے دیا۔ حیرا حسب معمول یہاں بھی بہت چہکیں اور فرحت زاہد اور زاہد سعید کے درمیان تو مسابقت کی لمبی دوڑ چلتی رہی۔ جناب محشر بدایونی اور جناب سرشار صدیقی تو اساتذہ سخن ہی میں سے تھے، جن کی ہر تازہ تخلیق سے اردو شاعری کی پیش رفت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مہمان شعراء کی پذیرائی کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ پاکستانی ڈاکٹر، انجینئر، سائنس دان اور ماہرین معاشیات دو بجے تک بیٹھے رہے اور اشتیاق اور تشنگی کا یہ عالم تھا کہ لوگ اٹھنے پر آمادہ نہ تھے۔ اس کے باوجود کہ اختتام تقریب پر تواضع کے لیے "رس ملائی" کے "ڈونگے" بھی ان کے منتظر تھے۔ (16 نومبر)

"گیتوں اور دوہوں کے عالمی انتخاب کی اشاعت"

راجستھان اردو اکادمی جے پور (انڈیا) ۱۹۹۴ء میں گیتوں اور دوہوں کا عالمی انتخاب شائع کر رہی ہے۔ ہند و پاک اور دوسرے ممالک کے شعرائے کرام سے درخواست ہے کہ وہ اپنے منتخب کردہ پانچ گیت [illegible] دو ہے [illegible] مع اردو پاسپورٹ سائز تصویر برائے اشاعت جلد از جلد مندرجہ ذیل پتہ پر ارسال کرنے کی زحمت فرمائیں۔

انعام الحق،
چیئرمین

بیت الفضل ۲۵۲۷، آگرہ روڈ، جے پور۔ ۳۰۲۰۰۳ (انڈیا)

پہلے ملنگ نے دوسرے ملنگ کیلئے سگریٹ میں چرس بھرتے ہوئے پوچھا تمہیں علم ہے۔ محبت کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں

میں----دوسرے ملنگ نے بے تابی سے سگریٹ کو منہ میں دباتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی ساتھ اسے سلگتی ہوئی تیلی دکھا کر زوردار کش لیا---- نہیں میں یہ تو نہیں جانتا کہ محبت کی کتنی قسمیں ہیں مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ محبت احتیاط پسندی کی طلب گار رہتی ہے یا یوں سمجھ لو کہ احتیاط کا دوسرا نام محبت ہے۔

احتیاط پسندی اور وہ بھی محبت میں' پہلے ملنگ نے سرور بھری آنکھوں میں حیرت سموتے ہوئے کہا۔ نہیں میں اس سے متفق نہیں ہوں محبت تو جنون و دیوانگی کا استعارہ ہے وارفتگی' شوق' جنون' پاگل پن نہ ہو تو محبت اسے کب کہا جاتا ہے تم اپنی جگہ ٹھیک کہتے ہو پھر بھی محبت کا ایک لازمی جزو احتیاط بھی ہے مگر کیسے اور

ہاں مجھے سب یاد ہے مگر نئی شادی کی بات ہی اور ہوتی ہے چہار دیواری کے اندر صرف ہم دونوں کا وجود ہوتا تھا مگر اب ہماری ایک جوان بچی بھی ہے کسی کا خیال کر لیا کرو اگر اسکی آنکھ کھل گئی تو؟

آنکھ---- نہیں میں اسے دیکھ کر اٹھا ہوں وہ دیکھو پلنگ پر اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ گہری نیند سو رہی ہے اور پھر ابھی اسکی عمر ہی کیا ہے بس یہی آٹھ نو سال مگر آٹھ نو سال کی عمر میں بھی عارفہ بلا کی ہوشیار ہے اور پھر ہمارا چھوٹا بیٹا ارشاد بھی پانچ برس کا ہو گیا ہے مگر فیروز تمہاری سمجھ میں ابھی تک میری یہ بات نہیں آئی کہ یہ بچے ہم سے زیادہ حساس اور ہوشیار ہیں روبی شکیلہ چھوڑو ان باتوں کو' دیکھو اور محسوس کرو باہر موسم کیسا ہو رہا ہے بارش لگی ہوئی ہے اور یہ کہتے ہوئے فیروز نے کچھ جرات کرنے کی کوشش کی ہی تھی کہ وہ ایک دم کروٹ بدل گئی میں کہتی

کیوں؟

اچھا میں اسکا جواب تمہیں ایک سچے اور روز مرہ زندگی کے ایک واقعہ کو سنا کر دیتا ہوں مگر درمیان میں---- آخر میں---- کوئی سوال مت کرنا

کمرے میں چھائے ہوئے گہرے سکوت کو ایک ہلکی سی آواز نے توڑ دیا اور اس کے ساتھ ہی کمرہ روشن ہو گیا اس کی نیند بہت حساس تھی فوراً آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ گئی دیکھا تو پائنتی پر فیروز بیٹھا اسے مسحور کن نظروں سے دیکھ رہا تھا وہ اسکی نگاہیں سمجھ گئی جھجک کر فوراً بولی۔

ہزار بار تم سے کہا ہے کہ جب بھی آنا ہو بلب بجھا ہی رہنے دیا کرو مگر تم بھی جانتی ہو کہ میری عادت بلب بجھانا نہیں ہے اور پھر اسوقت تو..... اسوقت کیا؟ اس نے بات کاٹتے ہوئے انتہائی کرخت لہجے میں کہا اسوقت کوئی خاص بات ہوتی ہے کیا؟

ہاں---- خاص بات ہوتی ہے تنگ پہاڑیوں پر سفر کیا جائے تو روشنی ضروری ہوتی ہے آدمی یہ تو دیکھ سکتا ہے کہ پھسل کر کہاں گر رہا ہے اور پھر چٹانوں کی رنگت' آسمان کا رنگ' اور بارش کے قطرے---- تم عجیب عورت ہو تمہیں تو جمالیات چھو کر بھی نہیں گذری ہاں مجھے جمالیات چھو کر نہیں گزری اور نہ ہی مجھے ایسی جمالیات پسند ہے

مگر پہلے تو تم...... یاد ہے ناں جب ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی تو وہ دن......

ہوں بتی بند کرو ورنہ میں اٹھ جاؤں گی۔

اچھا یار---- ایک تو تم بڑا تنگ کرتی ہو---- چند لمحوں بعد کمرے میں اندھیرا چھا گیا اسکے بعد ایک بوسے کی آواز ابھری---- آوازیں---- سناٹا ---- سناٹا---- آوازیں دبی دبی ریشمی لباس سرسرایا' چوڑیاں کھنکیں ---- دوسری سمت دس 10 سالہ آنکھیں اندھیرا شناس بننے کی کوشش کر رہی تھی

عارفہ بے حد خوش تھی آج پہلی بار کسی نے اس سے کہا تھا کہ وہی اس پر جیتا اور مرتا ہے یہ جینے اور مرنے کا فلسفہ بھی عجیب ہے کوئی کسی پر جیتا یا مرتا نہیں ہے مگر کسی کو یہ یقین دلا دیا جائے کہ وہی اس کیلئے جیتا یا مرتا ہے تو دوسرا احساس خود نمائی میں انا گزیدہ ہو جاتا ہے وہ بھی بارش میں بھیگتی ہوئی مورنی کی طرح ناچتی پھر رہی تھی آج نیاز نے کس دیدہ دلیری سے اسے روک کر اپنی محبت کا اظہار کر دیا تھا۔

اس بات پر اس نے کتنا غصہ کیا تھا---- مگر---- ہائے---- اندر اندر سے کتنا اچھا لگ رہا ہے اسکے کان تو کبھی سے منتظر تھے کہ کوئی اس سے کہے---- کوئی اس سے کہے---- جب وہ میٹرک کا امتحان دے رہی تھی تو اسکی سہیلیوں نے اسے کتنے قصے سنائے تھے اپنے چاہے جانے کے اور اپنے چاہنے والوں کے اور اسے یہ قصے سن کر یوں لگتا کہ اس کے اندر موجود کوئی وحشی بلب بجھا رہا ہے' جلا رہا ہے ریشمی لباس سرسرا رہا ہے' اندھیرا جھولے جھول رہا ہے کوئی سجدے کر رہا ہے ہاں

کوئی خدا کی تخلیق کو چھو کر اٹھ جاتا ہے پھر سجدہ ریز ہو جاتا ہے "سبحان تیری قدرت"

مگر میری تعریف کرنے، مجھے سجدہ کرنے کون آئیگا کون ہو گا جسے بارش کی پہلی بوند کے ساتھ ہی رقص کرنے کا جنون سوار ہو جائیگا اور آج نیاز نے اسے گہری نیند سے جگایا تو اسے یوں لگا کہ وہ اسے کہہ دے دیکھو بلب بجھا دو--- خوابوں ہی میں رہنے دو مگر نیاز اسے جاگتی آنکھوں کے خواب دیکھا رہا تھا وہ اس کے ساتھ اسکی کار میں بیٹھی گہرا سفر طے کر رہی تھی گاڑی اپنا سفر طے کر رہی تھی اور اسکا دماغ اپنا سفر طے کر رہا تھا شکر پڑیاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ ارد گرد کی فضا کتنی نکھری ہوئی ہے دور دور تک کھلی فضا میں ارد گرد کے مناظر واضح کونوں میں نظر آ رہے تھے اس نے سرشاری سے کہا

نیاز--- مجھے چھوڑ تو نہ جاؤ گے۔

نہیں--- ایسا نہیں ہو گا عارفہ--- نیاز کا لہجہ بھی کچھ عجیب سا ہو رہا تھا

تم میرے والدین کے پاس کب جاؤ گے -- نیاز تم تو جانتے ہو کہ میرے والدین مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں دونوں بوڑھے بھی ہو چکے ہیں ابو حال ہی میں واہ فیکٹری سے ریٹائرڈ ہوئے ہیں اور انہی کی خواہش ہے کہ میں ڈاکٹر بنوں جبھی انہوں نے مجھے اسلام آباد بھیجا اور یہاں ہوسٹل کا اہتمام بھی کرایا یہاں آکر تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے تم مجھے بھول نہ جانا-- عارفہ بے خودی میں بولتی چلی گئی دونوں اسی رو میں کافی آگے نکل گئے جہاں دور دور تک کوئی بندہ نظر نہ آ رہا تھا۔ نیاز اس کے ساتھوں ساتھ تو چل رہا تھا اچانک اس کے ہاتھ بے قابو ہونے لگے عارفہ یک دم چونک اٹھی--- یہ کیا کر رہے ہو تم.....

پیار--- محبت..... نیاز کا لہجہ تھا کہ..... وہ یک دم نروس ہو گئی نہیں نہیں یہ شادی سے پہلے گناہ ہے ایسا نہیں ہو سکتا۔

تم میری--- میں تمہارا---- یہ وعدہ ہمارا پکا ہے اب تمہیں اعتراض نہیں ہونا چاہیے کیا تم میری محبت کی معترف نہیں ہو اسکے ہاتھ بہکنے لگے تو وہ کپکپا کر دوسری طرف ہو گئی میں تمہاری محبت کی معترف ہوں مگر نیاز یہ نہیں ہو سکتا وہ ڈری ڈری سی بولی۔

کیوں نہیں ہو سکتا محبت اور جنگ میں سب جائز ہے یہ کہہ کر نیاز نے زبردستی اسے باہوں میں گھیر لیا۔ بوسہ تھا یا بجلی کا کرنٹ یکدم عارفہ کے ذہن پر اندھیرا چھا گیا ہاں بلب جل رہا ہے بجھ رہا ہے وہ اسے کہہ رہی ہے بلب بجھا دیا کرو--- مگر اندھیرا کیوں ضروری ہے؟ ریشمی لباس کیوں سرسراتا ہے؟ آدھی رات کو نہانے کی کیا تک ہوتی ہے؟ اسکا تشنہ ذہن بہت سے سوالوں کے جوابات سے سیراب ہونا چاہتا ہے اسی لمحہ نیاز کی آواز گونجی۔

میری محبت میری جوانی اس سیب کی طرح ہے جو جسم میں فولاد کی کمی پوری کر کے چہرے پر سرخی پیدا کرتا ہے۔ میں اس سیب کو فضا میں اچھال رہا ہوں اگر تمہاری قسمت میں ہے تو اسے پکڑ لو--- ورنہ ہماری راہیں جدا ہو جائیں گی۔

سیب آسمان میں بڑے تیزی سے اوپر اٹھا تھا اس لمحہ بدلتے موسم نے برسات کی پہلی بوند کو زمین کی پیاس بجھانے کیلئے بھیج دیا دوسری طرف کشش ثقل سیب کو نیچے لا رہی تھی عارفہ دیکھ رہی تھی وہ اس سے کافی دور تھا اور دور ہی گرے گا اس کے سوچتے ذہن میں بجلی آ رہی تھی بجلی جا رہی تھی۔ لباس سرسرا رہا تھا اندھیرا بہت کچھ بتانے کی کوشش کر رہا تھا وہ بھاگی اور بھاگی اس سے زیادہ تیزی سے بھاگی گرتے گرتے بچی مگر بھاگتی رہی اور پھر اس نے چہرہ اوپر آسمان کی طرف کر دیا اسکا منہ کھلا ہوا تھا اور آسمان سے گرتا ہوا سیب تیزی سے اسکے منہ کی طرف لپک رہا تھا۔

کمرے میں گہری خاموشی طاری تھی جیسے در و دیوار سوگوار ہوں' میت کی آمد ہو یا رخصت ہو ایک طرف اسکی بیوی سخت غصے پریشانی میں تھی اسے خود بھی کچھ کم پریشانی نہ تھی اسکا سر شرمندگی سے جھکا ہوا تھا ایک طرف اسکی بیٹی کوہان نما پیٹ لیے رو رہی تھی اسکا سر جھکا ہوا تھا اور اسکے کان میں اسکی بیوی کی آواز گونج رہی تھی۔

"فیروز' ہزار بار کہا ہے کہ جب بھی آنا ہو بلب بجھا ہی رہنے دیا کرو"

عارفہ نو سال کی عمر میں بھی بلا کی ہوشیار ہے تمہیں میری یہ بات کبھی بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ ہمارے بچے ہم سے زیادہ حساس' ہوشیار ہیں۔

ملنگ نے بھرے ہوئے سگریٹ کا آخری کش لیا اور سرور بھری آواز میں سوال کیا کیوں--- محبت میں احتیاط ضروری ہوتی ہے کہ نہیں؟

چلتے چلتے نقاب پوش نے شاید بات برائے بات پوچھا' سردار! تمہیں چاروں یگوں کی تفصیل معلوم ہے؟----؟ مگر سردار نے اس کے سوال کا جواب نہ دیا۔ اس نے چند قدم کے فاصلے پر اپنا استفسار دہرایا' مگر جواب ہنوز ندارد----اک لمبی خاموشی نے جب اس سوال کا جواب غیر ضروری کردیا تو سردار بولا! ــ یہ کل جگ نہیں کرجگ ہے پیارے۔

میرے عزیز! اگر میں تمہیں ست جگ' تریتا جگ' دواپر جگ اور کل جگ کی تفسیر بیان کردوں' تو بھی کیا حاصل ہو جائے گا؟ تم یگوں' موسموں' مذہبوں' اماموں' متوں' ورنوں' ویدوں' طرفوں' ضربوں' عنصروں' قلوں' منزلوں' تکبیروں---کی تفصیل جان کر کیا کروگے؟ بس چلتے چلو' تفصیلات کے تجسس کے بغیر----! اگر جستجو کرے گے تو پہلا اختلاف تعداد کی صورت میں پیدا ہو جائے گا اور پھر مدت مدید تک لوگوں میں یہ فیصلہ نہیں ہو پائے گا کہ زمانے چار ہیں یا تین؟ موسم چار ہیں یا پانچ؟ وہ تین ہیں چوتھا ان کا کتا؟ یا پانچ ہیں چھٹا ان کا کتا؟ یا سات ہیں آٹھواں ان کا کتا؟

مستفسر اگرچہ اتنی تاخیر سے اور متضاد توضیح سننے پر قدرے بے لطف بلکہ بددل ہوا' تاہم اسے دوران سفر گفتگو کا یہ بہانہ بساغنیمت محسوس ہوا' اس لئے اس نے

اصحاب کہف سے ایسٹ انڈیا کمپنی تک

جمیل احمد عدیل

مکالمے کی گیند کو نیچے نہیں گرنے دیا اور سردار سے سلسلہ تخاطب ٹوٹنے نہیں دیا ----لہٰذا اسے متوجہ کرکے گویا ہوا سردار! اگر تجسس اور فحص بے حیثیت چیزیں ہیں تو ہم کس کی تلاش میں سرگرداں ہیں؟ اب گفتگو کی گیند ایکبار پھر سردار کے ہاتھ میں تھی----مگر وہ حسب عادت صامت اور متین تھا' یعنی نقاب پوش نے اس کے شیزد فرینیا کو واضح کرکے گفتگو کا موقع ضائع کردیا۔ اب ایک ہی صورت تھی کہ انتظار کیا جاتا کیونکہ یہ بہت مشکل تھا کہ سردار کے کسی قول کی تردید کی جاتی یا اس کے پروقار سکوت میں لب کشائی کی جرات کی جاتی----طویل مسافت کا غبار ان کی روحوں اور راہوں کو گرد آلود کر تا رہا اور وہ مسلسل چلتے رہے۔

نقاب پوش کے بارے میں تو معلوم نہیں البتہ سردار کو اس سے بے طرح اپنی قدیم غار کی یاد آئی "جس کا رخ شمالاً جنوباً تھا' جب سورج نکلتا تو وہ اس غار کے دہانے سے دائیں جانب کو پھر جاتا اور جب غرب ہوتا تو اس کے دہانے سے بائیں طرف کتراتا ہوا نکل جاتا"----مگر اب سورج عین ان کے سروں کے اوپر پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا' وہ دونوں پسینے میں شرابور تمازت آفتاب سے بچنے کی بھرپور سعی میں مصروف تھے' اگرچہ انہیں کامیابی نہیں ہو رہی تھی مگر وہ کوشش کیے جا رہے تھے۔

عجیب تر بات یہ ہے کہ دونوں کے سفر ایک ہی سمت میں ہونے کے باوجود اپنی منزلوں کے اعتبار سے مطلقاً مختلف تھے۔ ایک غار کو خیرباد کہہ کر زندگی کی طرف رواں دواں تھا' دوسرا زندگی کی ہماہمی کو خدا حافظ کہہ کر غار کی جانب کوچ کر رہا تھا ----ایسے میں سردار کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کیونکہ اس نے مکالمے کے سائبان کو خود اپنے ہاتھوں سے اپنے سروں سے کھینچ ڈالا تھا' لہٰذا اس نے (بظاہر) خود سے کلام کیا (مگر فی الاصل یہ اس کے ہمسفر کے لئے دعوت سخن تھی)

"معلوم نہیں یہ راستے کب تک ہمارے تلووں کو چاٹتے رہیں گے؟"

نقاب پوش کہ گفتگو جس کی کمزوری تھی' میدان کو ہموار پا کر پھر کود پڑا۔ سردار! "مجھے تو یہ سیاہ سڑکیں' کالے پانیوں کے دریا محسوس ہوتی ہیں جن پر ہمارے وجودوں کی کشتیاں بہتی جارہی ہیں۔"

اس دوران میں غالباً سردار کی عقل ٹھکانے پر آچکی تھی اس لئے اس نے سلسلہ تکلم کو غنیمت یقین کرتے ہوئے بات کو جاری رکھنا ضروری سمجھا----ہاں میرے عزیز! تم ٹھیک کہتے ہو' بس فرق یہ ہے کہ تارکول کی یہ سڑکیں خوف زدہ بدنوں کی طرح سینہ خاک سے چمٹی رہتی ہیں اور دریا چلتے رہتے ہیں۔ وہاں خطرہ

جسموں میں روحوں کو سونے نہیں دیتا۔ سفر کا دریا اور خواب کی ناؤ' دونوں بیک وقت محو سفر رہنے چاہئیں' چاہے دونوں کی سمتیں متضاد ہی کیوں نہ ہوں۔ یوں طلب اور دعا کی زنجیر ٹوٹ نہیں پاتی۔

"مگر سردار! اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟"

"نہیں عزیز! کچھ نہیں' کچھ بھی نہیں کرنا چاہیئے ---- کیونکہ ہمارے کچھ بھی کرنے سے کچھ بھی فرق نہیں پڑے گا۔"

"لیکن سردار' تم تو کہا کرتے تھے' محض ایک زہر کی شیشی جیب میں رکھنے سے طرز احساس بدل جاتا ہے"۔

"ہاں مجھے اپنا یہ قول اچھی طرح یاد ہے' پر تم بھول گئے ہو' میں نے یہ بھی کہا تھا کہ مستقل رکھنے سے وہی احساس جامد ہو کر بے فائدہ ہو جائے گا ---- بس خود کو ہر لحظ خطرے کی حالت میں رکھو' اپنی سوچ کو مرتکز نہ ہونے دو' منتشر رکھو' جاگتے رہو گے' غافل نہیں ہو گے۔ ہاں عزیز! جس طرح ہر نئی چیز ایک پُر خوف اجنبیت کی جھلی میں لپٹی ہوتی ہے۔ اسی طرح اپنے وجود کی زمین کو نیا بنائے رکھو' اگر دھرتی نئی نہیں بنتی' نہ سہی' کم از کم سوچ کی بارش تو نئی ہونی چاہیئے ----"

"سردار! ابھی تم کہہ رہے تھے' کچھ بھی کرنے سے کچھ بھی فرق نہیں پڑتا اور اب خود دعوت فکر و عمل دے رہے ہو۔ یہ کیسا تضاد ہے؟" ------؟" یہ سوال منطقی طور پر نقاب پوش عسفر کے ذہن میں پیدا ہوا' مگر اسے چونکہ سردار کی' سردارانہ چپ' کا تلخ تجربہ ہو چکا تھا اس لئے اس نے خاموش رہنے میں ہی مصلحت سمجھی۔

سردار اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرایا۔ اب معلوم نہیں وہ اس کے اندر کی کیفیت کو بھانپ چکا تھا یا اس مسکراہٹ کا سبب کچھ اور تھا' پیار سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر بولا!

عزیز!" کچھ اندازہ ہے ہمیں چلتے ہوئے کتنا زمانہ بیت چکا ہے؟"

نہیں سردار! زمانے اب میرے اندازوں کے خیمے کی طنابیں کاٹ چکے ہیں' زمانے کی زمین اب میری سوچ سے بہت زیادہ پھسل چکی ہے ویسے برا نہ مانا اور پرسے تمہارے تقاضات سفر کو بے معنی کئے دے رہے ہیں۔ یہاں زمانوں اور منزلوں کے تعینات سے کیا حاصل ہو گا؟" ----- اس نے اپنی افتاد طبع کے خلاف اس بار سردار کی ناراضی کی پروا کئے بغیر اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔ اور سردار بھی توقع کے برعکس اس مرتبہ جلال میں آیا نہ خفگی والی خاموشی اختیار کی' بس مسکرا دیا اور موضوع کو شعوری طور پر بدلتے ہوئے بولا!

عزیز!" منجلوس غار میں چھپنے سے پہلے تم بھی طرطوس کے رہنے والے تھے؟"

عزیز کے چہرے پر نقاب میں سے صرف آنکھیں ہی جھانک رہی تھیں اس لئے اس کا قلبی تاثر معلوم کرنا ذرا مشکل تھا۔ بہر طور اس کی آنکھوں کے کونوں میں بڑی پُر راز مسکراہٹ جاگی وہ ذرا توقف کے بعد بولا!" اب سردار تمہارا خیال ہو گا کہ میں بھی دقیوس بادشاہ کی گرفتاری کے خوف سے منجلوس میں پناہ گزین ہوا تھا۔"

"تو اس میں کیا شک کی گنجائش ہے؟" سردار نے تعجب کا اظہار کیا پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گویا ہوا" اب کہیں یہ نہ کہہ دینا میں ۔میلخا کو نہیں جانتا۔"

نہیں سردار ایسی بات نہیں' ۔میلخا پر ہی کیا موقوف ہے' میں میکسل مینا' تمیلخا' مرطونس' کشطونس' بیرونس' و ۔ملموس' بطونس' قابوس ---- سب کو جانتا ہوں' اپنے بھائیوں کو بھلا کون فراموش کر سکتا ہے؟"

عزیز کی وضاحت پر سردار بظاہر مطمئن ہو گیا' مگر کسی گہری سوچ میں ڈوب کر بولا۔ عزیز! لوگ کہتے ہیں جب روم جل رہا تھا تو نیرو بانسری بجا رہا تھا' مگر لوگ بھول گئے ہیں کہ وہ عہد امن میں بھی بڑا ظلم کرتا تھا۔ ہمارے کتنے نوجوانوں پر اس نے زندگی نعمتیں اور آزادیاں حرام کر دیں۔ کتنوں کو صلیب پر چڑھا دیا' کتنے زندہ جلوا دیئے' کتنوں کو کتوں سے پھڑوا ڈالا' مگر کسی پیشوا نے صدائے احتجاج بلند نہ کی' ایسے شہر کو جل ہی جانا چاہیئے تھا اور ایسے بادشاہ کو اس وقت میں بانسری ہی بجانا چاہیئے تھی ---- اگرچہ بعد میں گاتھ قوم نے بڑی لوٹ مار مچائی' لیکن شاید ان تہہ خانوں کا انہی کے ہاتھوں لٹنا پھوٹنا مقدر تھا۔

"ہاں سردار! وہ لوگ بڑے ظالم تھے۔ مجھے ۔ب معلوم ہے' مجھے سب یاد ہے کہ ہیرو ڈ ۔لس کے واقعہ سے فلسطین میں اور نیرو کے زمانہ سے لے کر روم میں خود میرے اوپر سے بھی ظلم کی تین صدیاں گزر گئیں۔"

ہائے میرے عزیز! کیا زمانہ یاد کروا رہے ہو! ڈ ۔سں نے تو ظلم کی انتہا کر دی تھی' البتہ گالیس کے عہد میں معافی تو ہو گئی مگر تب بڑی دیر ہو چکی تھی اور قسطنطین کے دور میں قانون بنتے بنتے تو جانے کیا کچھ گزر گیا' کیا کچھ بیت گیا' تب جا کر تھیوڈلیس کی بادشاہت نعمت بن کر نازل ہوئی ---- اس ذکر میں سردار کو اپنے بچھڑے ہوئے اعزہ بے طرح یاد آنے لگے' وہ تقریباً روتے ہوئے بولا' عزیز! جبر کے اس سورج نے کسی ایک زمین تک اپنی زہریلی کرنیں محدود نہیں کیں بلکہ مصر کے شہر اسکندریہ میں' سسلی میں' مالٹا میں' نیلپز میں مہر ستم کی جگر سوز شعاعیں تیز بارش کی مانند برستی رہیں۔ پیہم برستی رہیں۔

سردار!" سنا ہے وہ تہہ خانے جنہیں گاتھ قوم نے حملہ کر کے لوٹ لیا' تین منزلوں پر محیط ہوتے تھے۔ اور ان کا رقبہ اندر ہی اندر آٹھ سو ستر میل کے قریب بنتا تھا۔"

"ہاں"! ---! سردار چونکا' مگر "سنا ہے" کا کیا مطلب؟ ---؟ عزیز!" تم اپنے

ہوش میں تو ہو؟"

سردار کے اظہار حیرت پہ وہ مسکرا دیا اور یہ مسکراہٹ اس کی آنکھوں کے پیالوں کے سرخ کناروں سے پھر چھلک پڑی، لیکن اس نے جلد ہی سنجیدہ ہو کر سردار سے دریافت کیا۔۔۔۔ سردار! جب تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو تاریک غاروں سے نجات ملی تو آخر اقتدار میں آنے کے بعد تم لوگ بھی اہل ایمان کے دشمن ہی ٹھہرے ۔۔۔۔ اور افسوس کہ نادان اہل ایمان نے تم لوگوں سے دوستی کر کے ہلاکت کو قبول کر لیا۔

اب سردار کی بے چینی حد سے بڑھ گئی۔ وہ نہایت متردد ہو کر بولا! عزیز تم کس زمانے میں سفر کر رہے ہو؟ لگتا ہے گرمی نے تمہارا مغز پگھلا دیا ہے۔ اس ویران گزرگاہ پر تمہیں کون دیکھ رہا ہے؟ سر سے یہ کپڑا اور چہرے سے نقاب اتارو تاکہ تمہاری عقل و خرد بحال ہوں۔

"نہیں سردار! احتیاط لازم ہے اور پھر خود تم بھی تو نقاب اوڑھے ہوئے ہو۔"

"میری اور بات ہے۔۔۔۔ سردار کی زندگی سے پوری قوم کی حیات وابستہ ہوتی ہے۔"

"میری بھی پھر اور بات ہے۔۔۔ اور سردار تم میرے بارے میں مطلق فکر نہ کرو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ لیکن شاید میری باتوں کی حدت تمہارے دماغ میں حرارت پیدا کر رہی ہے"۔۔۔۔ قبل اس سے کہ سردار اس کی تیکھی بات کا جواب دیتا وہ بولتا گیا! سردار! تم صاحب علم ہو اور اسی بنا پر تمہیں سب نے اپنا سردار منتخب کیا ہے۔ مگر کیا یہ درست نہیں کہ "جب سلامتی والے سلامتی سے دور جا پڑے تو بغداد کے بادشاہوں نے سپین کو نقصان پہنچانے کیلئے مشرقی رومی حکومت سے جو بازنطینی حکومت کہلاتی تھی صلح کی اور سپین کے اہل ایمان بادشاہوں نے بغدادی حکومت کے خلاف مدد لینے کیلئے پاپائے روم کو تحفے بھیجے اور اس سے صلح کی۔"

سردار اس کے عجیب و غریب بیان سے ازحد متحیر ہوا کیونکہ اس کے خیال میں درون خانہ ان "باریک جزئیات" کا معدودے چند لوگوں کو علم تھا۔ عام افراد کو یہ بھید شعوری کوشش سے منتقل نہیں ہونے دیا گیا تھا۔ بات صرف سرداروں کے درمیان محدود تھی۔ لہٰذا ایک معمولی غاروالے کی یہاں تک رسائی کیسے ہو گئی؟ یہ سوال تھا جو اس کے حلق میں مچھلی کے کانٹے کی طرح اٹک گیا لیکن وہ روایتی متحمل مزاجی سے بولا! عزیز! اگر پاپائے روم کو انہوں نے تحفے ارسال کیئے تو ان کے آپس کے نفاق سے ہمیں ہی فائدہ پہنچا۔ آخر اس میں ہرج ہی کیا واقع ہوا ہے؟

ہاں میرے عظیم الشان سردار! یہ کتاب تاریخ کا ایک عجوب باب تھا جو صدیوں بعد یعقوب کے نور نظر پر علم لدنی سے ظاہر ہو کر رہا وگرنہ اس کو خفیہ رکھنے کی کتنی کوشش نہیں ہوئی؟۔۔۔۔ سردار! ہم لوگ صرف اپنے ایمان کے جوہر کو بچانے کیلئے غاروں میں پناہ گزین ہوئے تھے۔ دروازوں پر کتے پہرے دار بنا کر رکھے تھے۔ جب دشمن حملہ آور ہوتا تھا ہمیں لکڑی کی سیڑھی بار بار ہٹانا پڑتی تھی۔ کبھی تیسری منزل میں چھپنا پڑتا تھا۔ سردار! کیوں بھول گئے ہو، وہاں کتنی زہریلی نمی ہوتی تھی۔ ہوا کا گزر تک نہیں تھا۔ کیسے دم گھٹتا تھا، کتنا حبس ہوتا تھا، تڑپ اٹھتے تھے ہمارے بوڑھے اور بچے اور عورتیں۔۔۔ لیکن جب ان غاروں سے نجات ملی تو ہم ہی اپنے جیسے اہل ایمان کے دشمن ٹھہرے۔ اور صد تاسف، بچارے نادان اہل ایمان ہم سے دوستی کر کے حلقہ ہلاکت میں جا گرے۔

"لیکن عزیز! تیرے دل میں آخر ان کیلئے اتنی ہمدردی کیوں کروٹیں لے رہی ہے؟"

"اسلیئے سردار ہاں اسلیئے کہ میں ان میں اور اپنے میں کوئی فرق نہیں پاتا۔ ہمیں ظالموں کی سنت پر عمل نہیں کرنا چاہیے تھا کہ ہم خود ظلم کی چکی میں پسنے کے تجربے سے گزر چکے تھے۔ سردار! ہمیں تو معلوم تھا ظلم کیا ہوتا ہے؟ غاروں کی وہ بھول بھلیاں جن سے باہر کا آدمی واقف نہیں ہو سکتا تھا۔ اپنے جسموں کو چھپانے کیلئے ہمیں قرن ہا قرن آہن گداز مشقت کر کے بنانا پڑی تھیں اور سردار تم ہی تو کہا کرتے تھے ایمان کا مقام جسم کے غار کے اندر اس سے بھی پیچیدہ راستوں سے گزرنے کے بعد آتا ہے۔ "شبانہ روز اس کی تعمیر کرو"۔۔۔۔۔۔۔!"

سردار! نیلی آنکھوں والے شمالی لوگ جو غاروں میں صدیوں سے سوئے ہوئے تھے لوگ انہیں جاگتا ہوا سمجھتے رہے حالانکہ وہ سوئے ہوئے تھے۔ کچھ معلوم ہے کتنے عرصہ بعد جاگے؟ "ہاں معلوم ہے، ہزار سال بعد۔ صلیبی جنگوں کے وقت۔" سردار نے مختصر سا جواب دیا۔

سردار یہ بھی کہو نا! کہ ایسے جاگے کہ اہل ایمان کو اپنی ساحری سے سلا دیا۔۔۔۔۔۔

کاش وہ مسحور باشندے ذوالنورین کے زمانہ کے بعد اس طرف توجہ کرتے!!! ۔۔۔

!!!لاریب اس وقت اگر وہ بازنطینی حکومت کو تباہ کر دیتے تو آج دنیا کا نقشہ اور ہوتا۔

سردار تم ہی بتاؤ کیا وہ ایسا کرنے میں حق بجانب نہ ہوئے؟ کیا رومی ظلم کرنے میں پہل نہیں کر چکے تھے؟

یہ کلمات ادا کرتے ہوئے نقاب پوش بیحد جذباتی ہو گیا، اس کی آواز کے پرجوش ارتعاش سے ایسا لگتا تھا جیسے لہو اس کے سر کی دیگچی میں بری طرح کھول رہا ہے۔ وہ رکا جیب سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور سردار کی نیلی آنکھوں کے سامنے پھیلا دیا ۔۔۔۔ سردار! دیکھو اس نقشہ کو، اپنے پالتو کتے کو پہچانتے ہو نا؟ اس نے صدیوں تک تمہاری حفاظت کی ہے۔۔۔۔ یہ وہی رومی بازنطینی حکومت ہے جو بحیرہ مارمورہ کے دونوں جانب یورپ کی حفاظت کرتی رہی ہے۔ دیکھو! اسے غور سے

دیکھو' یہ وہی کتا ہے جو دائیں بائیں لاتیں پھیلائے بیٹھا پہرہ دے رہا ہے۔ اور اب تم یہ دعویٰ کرتے ہوئے نہیں اتراتے ہو کہ 'ہماری سلطنت پر سورج غروب نہیں ہوتا۔

سنو سردار! تم جہاں سے آئے ہو' میں وہاں جا رہا ہوں۔ ہمارا راستہ ایک ہے' مگر منزلیں جدا ہیں ---- میں پھر کہتا ہوں تم جہاں جا رہے ہو' میں وہاں سے آ رہا ہوں ---- جب تم منزل سے ہمکنار ہو جاؤ' سورت میں قائم ہونے والے کمپنی بہادر کے کارخانے میں پہنچ جاؤ تو کسی دن ٹھنڈے دل سے غور کرنا کہ 1611ء میں مغلیہ حکومت نے خلیج بنگال میں جو تمہیں کام کرنے کی اجازت دی ہے تو اس میں کیا حکمت ہے؟ آخر اس تاریخ کو صدیوں قبل تاریخ کے ریشمیں پردے پر کیوں لکھوایا گیا تھا؟

سردار! تم نے ہمارے وطن پر بڑی چالاکی سے قبضہ جمایا ہے' مگر یاد رکھو چالاک شخص سے زیادہ بے وقوف کوئی نہیں ہوتا۔ بلاشبہ اب تمام ایشیائی ممالک اور افریقہ تک کا علاقہ مدافعت سے عاری ہو چکا ہے۔ سردار! میں تمہاری نیلی آنکھوں میں تمہارے روسی آباؤ اجداد کو دیکھ رہا ہوں۔ مجھے تمہارے بھائی - میلجا کی خوش اخلاقی بہت بھائی۔ بے شک اشیائے خورد و نوش خریدنے کیلئے تم میں سے اسی کو جانا چاہیے تھا ---- سردار! تمہیں دو سال سے گندم اور مصالحہ جات مل ہی رہے تھے' لیکن تم نے - میلجا کو اعلیٰ اخلاق کی میٹھی چھری دے کر ایک سوچی سمجھی سازش کے ساتھ بھیجا۔ وہ غار میں تمہارے لیے کھانا لے کر جانا چاہتا تھا' ہماری ساری تجارت لیکر چلتا بنا' اور ہم منہ دیکھتے رہ گئے ---- ہرچند اس ہزیمت کے عقب میں ایک اور طویل کتھا کا چراغ روشن ہے۔ ہاں سردار چکنے فرش میں پانی نہیں مرتا۔ ہمیں اپنی کوتاہ عملیوں سے انکار نہیں۔ مگر تقدیر شاید تمہارے آفتاب اقتدار کو عین نصف النہار میں غروب کرنا چاہتی ہے۔ تمہیں ضرور مقام لدپر ہی پسپائی ہوگی کہ یہ امر ہے اور یہ کبھی ٹل نہیں سکتا۔

عزیز کے خطابیہ انداز سے سردار کا شبہ یقین میں بدل گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کا نقاب نوچ ڈالا۔ واقعی وہ ان میں سے نہیں تھا۔ اگرچہ اس کی کالی آنکھیں ہی اس بات کی کافی دلیل تھیں' مگر جانے سردار نے اس طرف پہلے توجہ کیوں نہ کی؟ لیکن اب اپنے بیباک محکوم کو اپنے سامنے پا کر سردار کی نیلی آنکھوں میں خون اتر آیا ---- تمہاری یہ جرات ---- پلک جھپکنے میں لپک کر سردار نے تلوار سونت لی۔ قریب تھا کہ وہ ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیتا' مگر عزیز نے بھی ایک لمحہ ضائع کیئے بغیر تلوار نکال لی۔ سردار کا رنگ دھاز زرد پڑ گیا۔ اب سردار اور وہ آمنے سامنے تھے۔ ان ساعتوں میں سردار کو شدت سے احساس ہوا کہ سرداری کیلئے چند محکومین کا ہونا ناگزیر ہے۔ اس نے تیزی سے پیچھے مڑ کر دیکھا' مگر اس کے ساتھی شاید ابھی بہت دور تھے' اسلیے اسے ناامیدی ہوئی ---- اتنے میں عزیز نے کمال دکھایا کہ آناً فاناً ایک جھٹکے سے سردار کی تلوار چھین لی ---- تنہا سردار اب نہتا بھی تھا۔

دو تلواروں کے سائے میں اب اس کی تیسری تلوار پھر آزاد تھی! سردار! اگر تم میرا سر قلم کر چکے ہوتے تو کیا میری زبان سے ادا ہونے والے کلمات کو بھی اپنی تلوار سے کاٹ سکتے تھے؟ کیا تمہاری تلوار تمہارے سر کے پیالے کی تہہ سے میری باتوں کو کھرچ سکتی تھی؟ میری اطاعت کے اس سفر نے تمہیں سردار بنائے رکھا۔ ورنہ میری تلوار کی کاٹ اور بازو کا زور کسی طور تم سے کم نہیں۔ یاد رکھنا اطاعت اور غلامی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اگر مجھے تمہاری مزید اطاعت کرنا پڑی تو گریز نہیں کروں گا کہ مجھے ایسا کرنے کا حکم ہے' اسی کا حکم جس نے دو سمندروں کو چلایا ہے جن میں سے ایک تو بہت میٹھا ہے اور دوسرا زخم ڈال دینے والا نمکین اور کڑوا ہے اور اس نے ان دونوں کے درمیان ایک روک بنا دی ہے اور ایسا سامان بنایا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو پرے رکھتے ہیں' ملنے نہیں دیتے ---- کان کھول کر سن لو سردار! اس وقت تمہیں میرے ہاتھ سے بچانے والا کوئی نہیں۔ سردار خوف سے تھر تھر کانپنے لگا ---- موت اس کے سامنے وحشیانہ رقص کرنے لگی۔ لیکن عزیز نے دونوں تلواریں سردار کے آگے پھینک دیں ---- سردار جھکو اور ان تلواروں کو اٹھا لو کہ تمہیں ان کی ضرورت ہے مجھے اذن نہیں ہے تلوار چلانے کا۔ ہاں سردار یہ شمشیریں تمہارا بھروسہ ہیں۔ تمہارے تابع فرمان تمہارے ہی خلاف ان کو استعمال کریں گے ---- تمہیں جنگ کا عذاب ضرور گھیرے گا۔ جنگ تمہارے گھروں کے گرد ضرور خیمہ لگائے گی۔ تم جس قدر امن امن چلاؤ گے' اسی قدر گھمسا ہوا لوہا اور تانبا تمہارے سونوں پر انڈیلا جائے گا۔ تمہاری دلکش نیلی آنکھیں اندھی اور تمہارے حسین چہرے جھلس جائیں گے۔ تم امن کی خاطر اپنی سفید برادری سے دوستی کرو گے' مگر نتیجہ جنگ کے علاوہ کچھ نہ نکلے گا ---- باقی تم مجھے گزند نہیں پہنچا سکتے کہ میرے منہ سے نکلنے والی پھونک ہی تمہیں نمک کی طرح گھلا دینے کیلئے کافی ہے۔ (مستنبط)

محشر بدایونی

سنا تو ہے سب کچھ لبِ دوستاں سے
کبھی ہم نے بھی کچھ کہا ہے زباں سے

خروشِ سگاں سے نہ تھمنا سفر میں
مگر بچ کے چلنا دہانِ سگاں سے

ملا ہم طبیعت نہ کوئی بھی لیکن
کریں کیا کہ ملتے ہیں ہر مہرباں سے

سفر تو اُن کا جو پس ماندہ رہرو
جدا ہو کے پھر مل گئے کارواں سے

یہ کیوں ناسزا بارشیں ٹوٹتی ہیں
ہماری ہے کیا دشمنی آسماں سے

تعلق ہے فقر و قناعت سے اِن کو
غرض کیا فقیروں کو کارِ جہاں سے

اچانک یہ کیسا دہلنے لگا دل
یہ اب شورِ گریہ اُٹھا کس مکاں سے

اختر ہوشیار پوری

کب ایسا گماں تھا منزلوں پر
قدموں کے نشاں ہیں ساحلوں پر

مجبور تھے اپنے خوں کے ہاتھوں
کیا تبصرہ رُت کے قاتلوں پر

اب تک در و بام جل رہے ہیں
آیا تھا وہ رنگ محفلوں پر

اک وحی کی شکل بن گئے ہیں
اُترے جو طیور قافلوں پر

حرف اپنے لہو کو چاٹتے ہیں
آواز و قلم کے سلسلوں پر

ہم ہی نہ سمجھ سکے تھے ان کو
وہ گیت تھے طنز پاگلوں پر

ہاتھوں کی لکیریں بن گئے ہیں
ہنستے ہوئے زخم بسملوں پر

اک مہر لگا گئے ہیں اخترؔ
یہ ریت کے قافلے دلوں پر

صہبا اختر

تیری صورت کو، تصور نہیں کہتے جاناں
ہم جو حیرت کو تحیّر نہیں کہتے جاناں

خواہشِ نان و نمک کس کو نہیں ہے لیکن
فکرِ دنیا کو تفکّر نہیں کہتے جاناں

دل جو کرتے ہیں ادا، بعدِ حصولِ نعمت
ایسے سجدے کو تشکّر نہیں کہتے جاناں

مسندِ فن بھی ہے تائید خدا سے ورنہ
ہر تسلّط کو تقرّر نہیں کہتے جاناں

انقلابات کو معمولِ شب و روز سمجھ
ہر تبدّل کو تغیّر نہیں کہتے جاناں

ہر تعلّی میں تجلّی ہے چراغ دل کی
خود فروزی کو تفاخُر نہیں کہتے جاناں

جو پیمبر ہے پیمبری کہے گا خود کو
اس تعارُف کو تکبّر نہیں کہتے جاناں

کربلا راہ میں آجائے تو اہلِ ایماں
وہ جو بزدل ہو اسے حُر نہیں کہتے جاناں

چند لمحوں کی ملاقات کو صہبا کی طرح
زندگی بھر کا تأثر نہیں کہتے جاناں

ضمیر اظہر

جو بھی اچھا بُرا ہے دُنیا میں
نقش گر کی ادا ہے دُنیا میں

بے ثباتی نصیب ہر شئے کا
سب تغیّر نما ہے دُنیا میں

کیا سے کیا جانے اور ہونا ہے
کیا سے کیا ہو چُکا ہے دُنیا میں

کاشت جس نے نہ کی کوئی نیکی
بے ثمر وہ رہا ہے دُنیا میں

لوگ تقسیم کیوں ہیں طبقوں میں؟
ایسا کیوں مسئلہ ہے دُنیا میں؟

جب سے سُورج ڈھلا جوانی کا
گھُپ اندھیرا بسا ہے دُنیا میں

نقاش کاظمی

جب کبھی دیوار کا لہجہ سفر کرنے لگے
آدمی اینٹوں کی گہرائی میں گھر کرنے لگے

کون سا عہدِ وفا ہے لوگ خونِ خلق سے
عشق کی ہاری ہوئی بازی کو سَر کرنے لگے

رقصِ بسمل دیکھ کر مقتل میں تلواروں کے بیچ
ہم بھی اپنے خوں سے پیراہن کو تَر کرنے لگے

کیا عجب عہدِ ستم پرور ہیں دیوانوں کی فوج
زندگی خاموش لمحوں میں بسر کرنے لگے

پل بہ پل محلِ نظر ہے شانِ رسمِ عاشقی
زخم سینے کا سیا ماتھے کو دَر کرنے لگے

اوڑھ لی تعبیر کی مٹی کسی نے اور ہم
خواب کی صورت خلاؤں میں سفر کرنے لگے

اپنا فن نقاش رکھے گا بچا کر جہل سے
اب تو دنیا کا ہُنر سب اہلِ زر کرنے لگے

فضل حق

جسے دیکھو، وہی زیبائش دنیا مانگے
اِک مرا دل ہے کہ ویرانیٔ صحرا مانگے

گل تری زلف میں بکھرے تو چمن کہلائے
غنچہ کھلنے کو ترے لب کا اشارا مانگے

حسن کی ضد کہ رہے حسنِ حجاب، آئینہ
شوق گستاخ ہے، طوفانِ تماشا مانگے

زر و گوہر کے عوض، گوہرِ جاں بکتا ہے
کیا تری بزمِ ہوس میں کوئی مجھ سا مانگے

رتبۂ ذاتِ نبیؐ جس کو سمجھ آجائے
پھر نہ وہ اپنے لئے کوئی بھی رتبہ مانگے

آج وہ صورتِ حالات ہے جس میں واعظ
حفظ ایمان، لہو جان و جگر کا مانگے

مضطر اکبر آبادی

تعلق اپنے ماضی سے کسی کا۔گر نہیں رہتا
تو پھر اُس کا کوئی مرکز کوئی محور نہیں رہتا

سحر سے شام تک آخر میں کیوں مصروف رہتا ہوں
مجھے مصروفیت میں یہ خیال اکثر نہیں رہتا

اسے پھر بدگمانی کے اندھیرے گھیر لیتے ہیں
وہ مغلوبِ گماں جس کو یقیں خود پر نہیں رہتا

کسی صاحب نظر کا عکس پڑ جائے° جو پتھر پر
پگھل کر موم ہو جاتا ہے وہ پتھر نہیں رہتا

پہنچنا چاہتا ہوں آگہی کی اس بلندی پر
جہاں کچھ مختلف منظر سے پس منظر نہیں رہتا

بزرگوں کی جو شفقت سے کوئی محروم ہو جائے
تو یوں لگتا ہے جیسے سائباں سر پر نہیں رہتا

زباں پر حرفِ حق لانا کچھ آساں تو نہیں مضطرؔ
یہ ہے وہ مرحلہ جس میں سلامت سر نہیں رہتا

◎

سید عارف

ہر درِ خوشامد پر سر جھکاتے جاتے ہیں
اس طرح بھی لوگ اپنی قامتیں بڑھاتے ہیں

مصلحت پرستوں کی بے ضمیر بستی میں
دشمنی بھی کرتے ہیں پیار بھی جتاتے ہیں

جب بھی بے یقینی کی گرد چھٹنے لگتی ہے
وہ بھی روٹھ جاتے ہیں ہم بھی روٹھ جاتے ہیں

صبح تیرے چہرے سے اکتساب کرتی ہے
پھول تیری زلفوں سے خوشبوئیں چراتے ہیں

جب بھی شامِ ہجراں کی تیرگی اترتی ہے
ہم ترے تصور کی مشعلیں جلاتے ہیں

بھول کر کبھی اپنا تجزیہ نہیں کرتے
صرف دوسروں کو ہم آئینہ دکھاتے ہیں

اب یہ حال ہے سب لوگ دیکھ کر ہمیں عارفؔ
انگلیاں اٹھاتے ہیں قہقہے لگاتے ہیں

سرور انبالوی

ڈالی نگاہ عشق نے سارے جہان پر
لیکن وہ آکے ٹھہری اِسی خستہ جان پر

آیا سندیسہ موت کا پہلی اڑان پر
چھپ کر شکاری بیٹھا ہوا تھا چٹان پر

لاتا نہیں ہے جو مجھے وہم و گمان میں
چھایا ہوا ہے وہ مرے وہم و گمان پر

تختی پہ میرا نام جو اُس کی نظر پڑا
فوراً نشاں لگا دیا میرے مکان پر

وہ جن کو ہم نے جرأتِ گفتار کی عطا
پہرے لگا رہے ہیں ہماری زبان پر

شہباز پنجے جھاڑ کر پیچھے ہی پڑ گیا
اِک فاختہ کو دیکھ لیا تھا چٹان پر

وہ شیر کے شکار کا ارماں لئے ہوئے
ہیبت سے مر گیا ہے شکاری مچان پر

کتنی بلندیوں سے زمیں پر گرا چکور
جس وقت اس سے ہو گئے تھے بدگمان پر

فرزانگی کا اِس سے بڑا کیا کمال ہو
ہونے لگا زمیں کا گماں آسمان پر

بادل سرور تپتے سروں سے گزر گیا
برسا ہے ٹوٹ کر مرے کچے مکان پر

احمد صغیر صدیقی

ایک دھوکا تھا اگر عشق تو وحشت کیا تھی
اس قدر خوار ہوئے اِس کی ضرورت کیا تھی

کب یہ سوچا تھا کہ وہ آئے گا ملنے کے لئے
دیر سے سوچ رہے ہیں کہ شکایت کیا تھی

لمس تو دور کی شے ہے اُسے تکنا تھا محال
خواب ایسا تھا تو پھر جانے حقیقت کیا تھی

دل میں جو بات بھی آتی تھی وہ کہہ دیتے تھے
اِک بیبت سی مصیبت تھی یہ عادت کیا تھی

صاحب فقر ہیں بس اِس کی خوشی تھی ساری
ورنہ ہم خاک نشینوں کی امارت کیا تھی

○

انوار فیروز

گرچہ بپھرا ہوا سمندر تھا
میں بھی اپنی جگہ شناور تھا
سارا طوفان میرے اندر تھا
مضطرب کس لئے سمندر تھا
میں بھی چپ چاپ وہ بھی پتھر تھا
وقت رخصت عجیب منظر تھا
ہار میں تجھ سے مانتا کیسے
جو میرا ترا برابر تھا
تجھ کو دیکھا تو کیفیت یہ تھی
ہونٹ خاموش پاؤں پتھر تھا
مر گیا وہ تو پھر خیال آیا
وہ تو خوشبو کا اِک پیمبر تھا
ساحلوں پر مچا تھا اک طوفاں
رات خاموش کیوں سمندر تھا
کس سے شکوہ کروں مسافت کا
یہ سفر تو مرا مقدر تھا
میں نے شاید یہ خواب دیکھا تھا
وہ جو گھر پر تھا ایک پتھر تھا!
پرسشِ حال کو نہ آیا کوئی
آگ میں جب گرا ہوا گھر تھا
کس طرح ناؤ اپنی لے جاتے
ہر طرف آگ کا سمندر تھا
دھوپ کیسے وہاں پہ آپاتی
پیڑ میرے مکاں کے اندر تھا
میں نے فیروزؔ کیوں سزا پائی
مجھ کو میرا سبق تو از بر تھا

بشیر سیفی

نہ جانے یہ کیا حادثہ ہو گیا ہے
کہ سایا بھی مجھ سے جدا ہو گیا ہے

خموشی کے صحرا میں تنہا کھڑا ہوں
ہر اک ذرہ تخیل صدا ہو گیا ہے

سرِبزم منکر رہا جو خدا کا
اکیلے میں وقفِ دعا ہو گیا ہے

صدا سن رہا ہوں اب اپنے لہو کی
کہ مجھ سے مرا رابطہ ہو گیا ہے

مجھی سے وہ مجھکو چھپاتے ہیں سیفیؔ
مرے دوستوں کو یہ کیا ہو گیا ہے

محبوب ظفر

تم اپنی فکر کو بے شک اُڑان میں رکھنا
زمین بوس عمارت بھی دھیان میں رکھنا

نگاہ پڑنے نہ پائے یتیم بچّوں کی
ذرا چُھپا کے کھلونے دُکان میں رکھنا

ہمیں تو اہلِ سیاست نے یہ بتایا ہے
کسی کا تیر کسی کی کمان میں رکھنا

ہوائیں تیز بہت ہیں یہ چاہتوں کے دیئے
ذرا سنبھال کے اپنے مکان میں رکھنا

جدید عہد کے مقروض ہیں مرے بچّے
مرے خدا! انہیں اپنی امان میں رکھنا

تمہارا رنگِ سخن کوئی بھی رہے محبوبؔ
غزل کا ذائقہ اپنی زبان میں رکھنا

غضنفر ہاشمی

خطِ وجود سے باہر کبھی نکال مجھے
جو میرا اصل کرّہ ہے وہاں اچھال مجھے

کشید کر میری سانسوں سے زندگی خود کو
پھر اپنے ہاتھ سے لکھ اپنے خدّوخال مجھے

میں اپنے آپ کو خود ہی بنانا چاہتا ہوں
جو مجھ میں قید ہیں اُن موسموں میں پال مجھے

کوئی خیال سا رہتا ہے ہمسفر دل کا
سو اس خیال سے کردے کبھی نہال مجھے

نظام خانہ بدوشی قبول ہے لیکن
طِلسمِ حلقۂ خانہ سے بھی نکال مجھے

قدیر جاوید

اے نمودِ سبز موسم بن کھلے غنچوں میں ٹھہر
چاند ٹھنڈک دے کے مجھ کو درد کے لمحوں میں ٹھہر

آنکھ کہتی ہے کہ چل دے اب یہاں کچھ بھی نہیں
دل بضد ہے پھر انہی بچھڑے ہوئے رستوں میں ٹھہر

انتشارِ ذہن و دل ہے اَب پرستش میں مخل!
اے جبینِ عجز کچھ دیر اوَر ابھی سجدوں میں ٹھہر

آدمیت دنگ ہے سڑکوں پہ وحشت دیکھ کر
آج باہر کیا نکلنا، جاں بچا، کمروں میں ٹھہر

وقت کے اندھے نگر میں مجھ کو کرنا ہے سفر
جذبِ آہن موج بن کر جسم کے خلیوں میں ٹھہر

صنعتِ گفتار سے آراستہ جملوں کے بیچ!
رفعتِ اخلاص سے نکھرے ہوئے لفظوں میں ٹھہر

کثرتِ افکار سر پر، ایسے عالم میں قدیرؔ
عارضِ خوشبو کے رنگیں بیکراں جلووں میں ٹھہر

اختر شیخ

ہوتا ہی چلا جاتا ہے ہونا، نہیں ہوتا
اس حال میں مٹی نے تو سونا نہیں ہوتا

بوسیدہ سہی زیرِ بدن رکچھ تو رہا ہے
یک ریشۂ خواہش نے بچھونا نہیں ہوتا

چرچا ہے عجب، شہر میں اُس قامت و قد کا
آئینہ تو ہو جانا، کھلونا نہیں ہوتا

پہلے ہی تحیّر سے ہے لبریز یہ دُنیا
یکساں ہے یہاں معجزہ ہونا، نہیں ہوتا

کتنا بھی جُدا کھیل ہو، اس موج سے اخترؔ
دریا کو ہی دریا میں ڈبونا، نہیں ہوتا

رب نواز مائل

اک نئے رنگ کے کل جو بھی اُجالے ہوں گے
اُن سے کچھ کام کے میرے بھی حوالے ہوں گے

اپنی دُنیائیں سجائے ہوئے رکھنا جو ہوا
ہم نے بھی آہوں سے پیکر کئی ڈھالے ہوں گے

دل کے ہر رنگ کے رشتوں کی ثنا خوانی ہو
دُکھ سبھوں نے یہاں اِس کے بھی تو پالے ہوں گے

ایک لمحے کو بھی آزاد جو کچھ ہو جائیں
ہم نے خیمے نہ کہاں شوق کے ڈالے ہوں گے

کہہ رہی ہے یہ فضا ہم سے بہ اندازِ ہزار
اِس برس خواب بھی ہم سب کے نرالے ہوں گے

اُس میں گہرائی نہیں ہے یہ کہوں گا مائلؔ
جس طلب سے لگے ہونٹوں پہ نہ تالے ہوں گے

○

عظیم راہی

جو ترے دام سے نکل نہ سکے
کفِ افسوس بھی وہ مل نہ سکے!

اس کے آگے بھی مرحلے ہیں کئی
وہ قیامت ہی کیا جو ٹل نہ سکے

رہ بروں نے کچھ ایسی چال چلی
ہم ترے ساتھ ساتھ چل نہ سکے

منزلوں کا حصول ممکن تھا
ہم مگر راستا بدل نہ سکے

وہ کوئی دل نہیں ہے، پتھر ہے
گود میں جس کی درد پل نہ سکے

ایک ہی بار لڑکھڑائے تھے
عمر بھر پھر کبھی سنبھل نہ سکے!

پڑ گئی سرد شعلہ کاریٔ عشق
ہم تو اِس آگ سے بھی جل نہ سکے

مدتوں بعد وہ ملے ہیں عظیمؔ
کاش یہ رات آج ڈھل نہ سکے

چہار

تلاش

تنہائی کے جنگلوں میں
زندگی کا بوجھ اٹھائے ہوئے
میں نے دیکھا
نیلم کی مانند چمکتا دمکتا
محبّتوں اور چاہتوں کا پھول
کھل رہا تھا
پھول کے من میں ---- میں نے بسنا چاہا
پھول کی پنکھڑیوں کو سہلاتا رہا
ہاتھ رنگوں میں رنگتا رہا
پھر میں نے سی دیا
پھول کا ہر بکھرا ہوا تراشہ
یہ سوچ کے
پھول کو اس وقت تلاش ہے
سورج کے نرم لبوں کی
آدمیّت کے نادر محبوب کی

ooo

باتیں امن کی

دنیا کے مالک
باتیں امن کی کرتے ہیں ---- جہاں
خوف کے پنجروں میں
محبوس عوام
قحط، بھوک اور مفلسی کا لباس پہنے ہوئے
نیوکلیئر کی فصلوں کو لہلہاتا دیکھ رہے ہوں
جن پر ---- ترقی یافتہ ملکوں کے جہاز
بازوں کی طرح
جھپٹنے کا انتظار کر رہے ہوں
نیوٹران انسانوں کا مذاق اڑا رہا ہو
جہاں ہر طرف
ظلم کے سائے ناچ رہے ہوں
وہاں دنیا کے مالک باتیں امن کی کرتے ہیں
لیکن!
امن کیسے آئے؟ میرے دوست!

ooo

مغلیہ ثقافت

صدیق کلیم

(۱)

درباری راگ

دھن دھن دھن / دھن دھن دھن / دھن دھن دھن / دھن دھن دھن

جلال شاہی۔ جمال شاہی کا اجتماع جمیل و پُرفن
یہ تمکنت۔ یہ وفور عیش و طرب کا راز و نیازِ پیہم
یہ دلنوازی۔ یہ شدت جاں گداز کا سوز و سازِ پیہم
یہ رس بھری سر۔ یہ جاں فزا تان سب کے دل میں اُتر گئی ہے
وفور مستی میں دلربا نغمگی فضا میں بکھر گئی ہے
جنون و ہوش و خرد کی لہریں۔ سرورِ جاں ہے فضائے نغمہ
یہ سرخوشی۔ وجد کی یہ حالت۔ یہ کیفیت ماورائے نغمہ

(۲)

رقص

رقص کی لَے پر جیون سارا گھومتا جائے
ساز کی لہروں پہ تھرکتی جائے لہرائے

چھنن چھنن چھنک چھنک اُچھلے کودے گائے
گھومے۔ لہرائے۔ پتلی کمریا بل کھائے
سر پر ساون ایسی کالی کالی گھٹائیں
مار آسا زلفیں۔ لہرائیں۔ ڈستی جائیں

مکھن ایسے گالوں میں ہے چمکیلی تاب
اور ہونٹ ایسے جیسے ہو سرخ گلاب
چٹی گردن ایسے جیسے لمبی صراحی
گرمی کی راتوں میں دل کی پیاس بجھائے

اور پوریں جیسے توری لمبی مخروطی
کالی آنکھیں ہیں جیسے ہرنی کی آنکھیں
لانبا۔ بوٹا سا قد جیسے بید کی شاخیں
پاؤں ہلکے۔ لانبے پتلے گورے چٹے
چال ایسے جنگل میں مور کا ناچ
اُبھرا اُبھرا سا جوبن مسکائے گائے
تھرک تھرک لٹک لٹک مٹک مٹک لہرائے
نغموں کی رسیا خود اک نغمہ بن جائے
آرٹ کا یہ رنگیں پیکر سب کو برمائے
یہ حسن کی دیوی ہم سب کے ہوش اُڑائے
خود ناچے سنگ اپنے سب کو ناچ نچائے
مدھر مدھر سحر آگیں دنیا میں لے جائے

ایک زیرِ تحریر طویل نظم سے اقتباسات

ممتاز مفتی کی ۸۹ ویں سالگرہ پر:

بلقیس محمود

شہنشاہِ ابد کا شکریہ
اک اور ایسا دن دیا ممتاز مفتی کو
کہ جب دانائیوں پر
ایک رُت گلپاشیونکی اور زندہ ہو
کمالِ وقت کے حُسن آفریں شہکار
قرطاسِ ادب پر اور روشن ہوں
اک ایسا یومِ پیدائش
کہ انسانوں کو تکمیلِ تمنا کا
وہ منظر پیش کرتا ہے
بصیرت اور بصارت
وقت کے ہمدوش جب
عرفان و آگاہی سے ملتے ہیں
کہ جب انسان
تصویری تصور سے تصوف تک پہنچتا ہے
اُسے قدرت نے خوش قسمت بنایا ہے
گزرتے وقت کے ہر ایک لمحے کو
بڑے بھرپور معنی خیز لفظوں کے
خزانے دے دیئے ہیں

ہزاروں لوگ جن بنجر زمینوں پر کھڑے تھے
وہیں رنگوں کے
خوشبوؤں کے
لذت خیز زندہ ذائقوں کے
حسن پیدا کر دیئے ہیں
مبارک آپ کو ممتاز مفتی جی
کہ یہ گزرے نواسی سال
نوے جانفزا قرنوں کی زندہ آبرو ہیں
نواسی سال
بیناؤں کی اور بینایوں کی آرزو ہیں
نواسی سال
قرطاس و قلم اہلِ قلم کی جستجو ہیں
مبارک آپ کو ممتاز مفتی جی
تشکر وقت کا
کہ آپ کے اندر سے وہ درویش باہر آگیا ہے
جسے نا وقت نے پردے میں رکھا تھا
یہی درویش اہلِ آگہی کی جستجو تھا
مبارک آپ کو ممتاز مفتی جی

11 ستمبر 1994ء راولپنڈی اسلام آباد کے قابل احترام اہل قلم کی ادبی تنظیم "رابطہ" کے اجلاس میں ممتاز افسانہ نگار محترمہ نیلو فر اقبال کے دولت کدہ پر بسلسلہ جناب ممتاز مفتی کی 89 ویں سالگرہ پڑھی گئی۔

نویں پرانی لوک کہانی

غنیم سہگل

میں صبراں دے ٹھنڈے گھڑ
پانی وچہ گھلو کے
اکھاں وچہ جگراتے پالے
کئی رات آن سوتے
فجرویلے اکھ پٹ کے تکیا
کی تکیا کی دساں
"سک ٹھسکے بیٹھے ہس دے
تک تک میرے وَلے
میں جہناں دی خاطر کھادے
ساری رات ڈبو کے
چیر کلیجہ دِتا میرا
رتراں دے اس دھوکے
فیروی مَن پالی نہ مٹے
مُڑ مُڑ مینوں ٹوکے
وِیکھ کتے سپنا نہ ہووے
تک خاں وند کھبوکے"
جھوٹیاں سچیاں طفل تسلّیاں
دے دے مَن پرچاواں
"سوہنڑی وی تے ڈب موئی سی
کچے گھڑے دے دھوکے"
"عاشق لوک سودائی ہوندے
اوکھے پینڈے لبھدے
ہسدیاں ہسدیاں سُولی چڑھدے
چھلّاں ماردے بُڑتوں نہ ڈردے
موت دے نال ٹھٹھولے کردے
تے امر کہانی لکھ جاندے نیں
لہو وچہ قلم ڈبو کے"
پر کوئی کہانی کوئی تسلی
دل نوں نہ پرچاوے
وریہاں پچھوں یاد آئی اک بھلی لوک کہانی
"جس ڈیوے دی آس تے بہہ کے
ساری رات لنگھائی
فجراں ویلے اوہلے ہویا
جگنو سی ہرجائی"

شوکت مہدی

جس راہ آوے اوسے راہیں پھل کھلاری جاواں
اوہ آوے تے اوہدے ناں توں واری واری جاواں

دیسوں باہر ٹُر گئے سارے میں وطناں تے کلّا،
کلّا، کلّا ای رہندا اے واجاں ماری جاواں

لوکی کہندے بھل جا اُس نوں کاہنوں آساں لائیاں
خبرے کیہڑی آس تے بیٹھا بازی ہاری جاواں،

رُکھاں دی چھاں یاد آوے تے ڈگ ڈگ ہنجو پینڈے
ننگے پیریں، دُھپاں جھل کے قرض اُتاری جاواں

ہن تیکر تے اس دا کوئی خط نہیں آیا مہدیؔ
ایتھے رہ کے مر جاواں گا ایس اتواری جاواں

شوہر خوش نصیب ہے کہ بیوی اس کی خدمت کرتی ہے۔ کھانا تیار کرنا' چائے بنانا' سر میں تیل ڈالنا' پیر دابنا' کپڑے دھونا اور استری کرنے سے لے کر تیمارداری تک حسنِ خدمت کی ایک طویل فہرست ہے۔ اس ضمن میں برصغیر کا شوہر کچھ زیادہ ہی خوش قسمت واقع ہوا ہے۔ برصغیر میں بیوی' شوہر کی خدمت کو ایک مقدس فریضہ اور اپنے لیے اعزاز سمجھتی ہے۔ ویسے بعض صورتوں میں یہ ایک ناقابلِ فرار مجبوری بھی ہے۔ دوسرے مقامات پر بیوی شوہر کی خدمت کو کیا سمجھتی ہے اور آیا وہ بھی شوہر کی خدمت کرتی ہے یا صرف حکم چلاتی ہے' اس بات کا مجھے اور نہ ہی میرے دوستوں کو کوئی تجربہ حاصل ہے۔

ہوا یوں کہ ایک دن دفتر میں میری ناک گدگدائی' مسلسل چار چھینکیں آئیں۔ ناک سے کچھ جل بہا اور پھر میرا ماتھا گرم ہوا۔ سر درد اور اعضاء شکنی پریشان کرنے لگی تو میں چھٹی لے کر گھر پہنچا۔ بے وقت گھر پہنچنے پر بیوی نے استفسار کیا۔ "آپ اس وقت کیسے آگئے۔ دشمنوں کی طبیعت تو ٹھیک ہے"

میں نے جواب دیا "بیگم دشمن تو مزے میں ہیں لیکن مجھے ہی نزلہ کی تحریک معلوم ہوتی ہے"

بیوی نے پریشان ہوتے ہوئے میرے ماتھے کو چھوا "خدا خیر کرے آپ کو اچھا خاصا بخار ہے" اور پھر سوالات کرنے لگیں۔ صبح بھلے چنگے دفتر گئے تھے۔ یہ موا بخار کب آیا۔ کیسے آیا۔ کیوں آیا۔ جاڑا تو نہیں ہوا۔ کیا کھانسی ہے۔ کیا ناک بہہ رہی ہے۔ اجابت تو صاف آئی تھی۔ کینٹین سے الم غلم تو نہیں کھایا۔ ڈاکٹر کو دکھایا۔"

میں نے بیوی کو سمجھایا "آپ پریشان نہ ہوں۔ معمولی بخار ہے جیسے آیا ہے ویسے ہی چلا جائے گا۔"

بیوی نے کہا "پریشان تو خیر میں ہوں نہیں۔ بیماری انسان ہی کو آتی ہے۔ میرے خیال میں آپ ٹھنڈے پانی سے نہانا بند کر دیں۔ نہانے کے بعد دفتر جانے کی جلدی میں سر برابر نہیں پونچھتے۔ لگتا ہے سردی جم گئی ہے اور یہ روز روز کا نہانا بھی ٹھیک نہیں ہے۔"

میں بحث کے موڈ میں نہ تھا "ٹھیک ہے۔ گھر میں اسپرین ہو تو دیجیے"

جواب ملا "دوائیں ڈاکٹر مشورے کے بعد ہی استعمال کیجیے گا۔ فی الحال دودھ میں ہلدی جوش دے کر لائی ہوں۔ ہلدی اور گرم دودھ سردی کا توڑ ہے۔ سونے سے قبل انڈا اور کالی مرچ بھی فائدہ پہنچاتی ہے۔"

بیوی گرم دودھ ہلدی کا گلاس لے آئیں اور پینے کے لیے اصرار کرنے لگیں۔ عجیب سے زرد سیال کو پینے کے لیے طبیعت مائل نہ تھی۔ لیکن بیوی کے اصرار پر کہ یہ نسخہ ان کی پرداری اور دادی جان کا آزمودہ ہے' آنکھ اور ناک بند کر کے پینا پڑا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ منہ کا اپنا کوئی مزا نہ تھا۔ منہ میں بخار کا مزا رچا بسا تھا۔ کوئی شے بھاتی نہ تھی۔ کچھ دیر بعد بیوی بادام کا ہریرہ لے آئیں "اٹھیے ہریرہ پی لیجیے"

"ابھی دودھ پیا ہے۔ بھوک بھی نہیں ہے۔ مجھ سے ہریرہ نہ پیا جائے گا" میں نے اپنا منہ دوسری جانب پھیر لیا۔

بیوی سمجھانے لگیں "دودھ میں پانی زیادہ تھا۔ ہریرہ میں بھی پانی ہی ہے۔ سمجھیے پانی پی رہے ہیں۔" اور پھر پیار سے لبھاتے ہوئے ہریرہ کا گلاس میرے منہ سے لگا دیا۔ دو چار گھونٹ پی کر میں نے منہ پھیر لیا۔ بیوی مصنوعی غصہ سے

پیر پٹکتی چلی گئیں۔ میں آنکھیں بند کئے ہاتھوں میں اپنے سر کو جو درد سے پھٹا جا رہا تھا' تھامے لیٹے رہا۔ چند منٹ گزرے ہوں گے کہ بیوی گوشت کا شوربہ لے سر پر آن کھڑی ہوئیں۔

"شوربہ پی لیجئے تو ہم ڈاکٹر سے مشورہ کر آتے ہیں۔"

شوربہ پینے سے انکار کیا تو بیوی نے کہا "بچوں سی ضد نہ کیجئے۔ خالی پیٹ بیماری سے مقابلہ کیسے ہوگا۔ ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔ معدہ اور جیب میں کچھ تو ہونا چاہیے۔ ضرورت اور بلا ضرورت ڈاکٹر سوئی بھی لگا دیتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ چکر آجائے۔

میں نے بیوی کو سمجھانے کی ناکام کوشش کی۔ "آپ بے فکر رہیے مجھے کچھ نہ ہوگا۔ زندگی بھر تو کھاتا پیتا رہا ہوں۔ ایک دن نہ کھانے سے مجھے کچھ نہ ہوگا۔" لیکن تریاہٹ کے آگے کچھ نہ چلی۔ شوربہ کو حلق میں انڈیلنا پڑا۔

شوربہ پلانے کے بعد ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے بیوی نے میری پیکنگ شروع کی۔ بنیان دربین' شرٹ' سوئٹر' کوٹ اور پھر اوور کوٹ۔ پیروں میں دبیز اونی موزے ہاتھوں میں دستانے' چہرے پر بندر ٹوپی اور بندر ٹوپی پر مفلر۔ میری صرف دو آنکھیں ہی نظر آرہی تھیں۔

میں نے بیوی سے کہا "آکسیجن بھی دے دو۔ چاند پر چلا جاؤں گا۔"

بیوی نے ڈانٹا "فضول باتیں نہ کیجئے بدشگونی ہوتی ہے۔" میرا بازو پکڑ کر اٹھانے لگیں۔ چند گھنٹوں کے بخار نے مجھے اتنا کمزور بھی نہ کیا تھا کہ بیوی کے اٹھانے سے اٹھ جاتا۔ دو تین مرتبہ زور لگانے کے بعد بیوی نے تھک ہار کر کہا "میں بچوں کو بلاتی ہوں۔"

"ضرورت نہیں ہے" کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے پیروں پر چلنے لگا۔ پھر بھی بیوی میرا بازو تھام کر چلنے میں مدد کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔ میں نے شرارتاً اپنا بوجھ ان پر ڈالا اور وہ لڑکھڑانے لگیں لیکن مجھے نہ چھوڑا۔ گھبرا کر پوچھ "کیا چکر آرہے ہیں"

میں نے جواب دیا "ہاں۔ عرصہ بعد آپ اتنا جو قریب آئی ہیں۔"

بیوی نے انتباہ دیا "بیماری میں بدپرہیزی ٹھیک نہیں ہوتی۔"

"ہم دواخانہ پہنچے۔ میں اطمینان سے آنکھیں بند کئے مختلف کپڑوں میں محصور اپنی باری کا انتظار کرتا رہا جبکہ میری بیوی پہلو بدل کر بے چینی سے کبھی ڈاکٹر کے کمرے میں جھانک آتیں تو کبھی نرس سے جلدی کے لیے کہتیں۔ آخر میری باری آئی اور ڈاکٹر کا دیدار نصیب ہوا۔ فیملی ڈاکٹر نے مجھے نہ پہچانتے ہوئے بیوی سے سوال کیا "کیسے مزاج کیسے ہیں۔ اس گٹھڑی میں کسے لائی ہیں۔"

بیوی ناراض ہو کر کہنے لگیں "گٹھڑی میں کیا مطلب۔ یہ میرے شوہر ہیں۔"

میں اپنے خول سے باہر آنے لگا تو ڈاکٹر "معاف کیجئے" کہہ کر ہنسنے لگا

میں اپنی شکایات سنانے سے پہلے بیوی ڈاکٹر سے کہنے لگیں۔ "شام سے تیز بخار ہے۔ سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ ہاتھ پیر بہت درد کر رہے ہیں۔ ناک سے پانی نل کی طرح بہہ رہا ہے۔ گلے میں خراش ہے۔ نگلنے میں تکلیف ہے۔ کھانسی ابھی شروع نہیں ہوئی۔ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ بھوک نہیں ہے کچھ کھا پی نہیں رہے ہیں۔ دودھ تک پینے سے انکار کرتے ہیں۔ آپ انہیں سمجھایئے۔ اگر غذا استعمال نہ کریں تو اور کمزور ہو جائیں گے۔ بیوی سانس لینے کے لیے رکیں تو ڈاکٹر نے میری جانب دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں "تمہیں کچھ کہنا ہے" میں نے بھی آنکھوں سے کہا "میری تکالیف کچھ زیادہ ہی بیان کردی گئی ہیں مجھے ان میں کوئی اضافہ نہیں کرنا ہے۔"

ڈاکٹر نے میرا طبی معائنہ مکمل کیا تو بیوی استفسار کرنے لگیں "کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے۔ کیا ملیریا ہے۔ جاڑا تو نہیں ہوا۔ میرے خیال میں ملیریا نہیں ہوگا۔ کیا یہ تعدادی بخار ہے۔"

ڈاکٹر نے جواب دیا "معمولی بخار ہے۔ سردی زکام کا بخار"

بیوی نے مشورہ دیا "قارورہ اور خون کا معائنہ کروالیں"

ڈاکٹر نے سمجھایا "آپ پریشان نہ ہوں۔ دو ایک دن میں یہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔"

بیوی نے سوال کیا "غذا میں کیا دوں"

"سب کچھ" ڈاکٹر نے بیزارگی سے جواب دیا۔

"چاول بھی"

"جی"

"لیموں"

"لیمو بھی دیجئے"

"لیکن-----" بیوی اپنا جملہ مکمل کر نہ پائیں تھیں کہ ڈاکٹر نے کہا۔"

"لیکن مت دیجیے۔ بدہضمی ہوگی۔

ڈاکٹر کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بیوی نے پھر سوال کیا "خدا ناخواستہ اگر طبیعت بگڑی تو کیا کروں۔"

"کسی وقت بھی مجھے یاد کیجئے گا" ڈاکٹر نے جواب دیا اور دوسرے مریض کی طرف متوجہ ہو گئے۔

بیوی نے واپسی کے لیے میری ری پیکنگ کی اور مجھے ہوا سے بچاتے ہوئے گھر لائیں راستہ میں، میرے معدے میں ہلدی دودھ اور شوربہ کے درمیاں فساد شروع ہوا۔ مجھے سواری سے سیدھے باتھ روم جانا پڑا۔ آدھے گھنٹے کے دوران جھنک کر تین اجابتیں آئیں۔ بیوی پریشان ہو اٹھیں۔ پڑوسن سے مشورہ کیا۔ دونوں نے مرض کی تشخیص کی کہ مجھے نظرِ بد لگی ہے۔ راستہ اور دفتر میں معلوم نہیں کیسی کیسی نظروں سے پالا پڑتا ہے۔ مجھے لگی نظرِ بد کو اتارنے کا فیصلہ کیا گیا۔ میں انہیں سمجھاتا رہ گیا کہ مجھے نظر کیا لگے گی۔ میری نظر تو ہر دم ادھر ادھر لگی رہتی ہے۔ بیوی نے ایک نہ مانی۔ کالی مرغی، بلھاویں اور کالی مرچ سے میری نظر ایسے اتاری گئی جیسے فلموں میں ہیرو کی آرتی اتاری جاتی ہے۔

غذا کے نام پر ایک کٹورا دودھ میں بھیگا ہوا ڈبل روٹی کا گودا، دو بسکٹ اور ایک گلاس سیب کا عرق سامنے آیا۔ چائے کی لت کے بعد دودھ اچھا نہیں لگتا اور پھر روٹی کا گودا، بسکٹ اور عرق۔ معلوم نہیں بیماری کے دوران کیوں انگریزی کھانے زہر مار کرائے جاتے ہیں۔ یہ بات بھی نہیں کہ انگریز اپنے کھانے کھا کر بیمار نہیں پڑتے۔ انہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ صدا خون کی کمی اور سفید خون کے عارضہ میں مبتلا ہیں۔ میں نے پلیٹ کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے تھوڑا چاول، لہسن کی چٹنی اور بھنا ہوا گوشت دیجیے"

بیوی نے حیرت کا اظہار کیا "بخار میں گوشت کھائیں گے۔ جگر خراب ہو گا۔

"لیکن ڈاکٹر نے سب کھانے کی اجازت دی ہے۔"

"کہنے میں کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر یوں ہی کہہ دیتے ہیں۔ بھگتنا تو مریض کو پڑتا ہے بخار کم ہونے دیجیے میں آپ کو مرغ مسلم، دم کا گوشت، کڑھائی گوشت، آپ جو کہیں گے وہ بنا کر کھلاوں گی۔"

میں خیالی پلاؤ تناول کرتے ہوئے بسکٹ اور روٹی کے گودے کو سیب کے عرق کے ساتھ حلق سے اتارا۔ کچھ لمحوں میں مجھے نیند آگئی اور میں سو گیا۔ طبیعت ناساز ہو تو نیند بھی برابر کہاں آتی ہے۔ دو گھنٹہ بعد میری آنکھ کھلی تو ڈاکٹر کو اپنے اوپر جھکا پایا۔ سر پر ٹھنڈے پانی میں تر تولیہ لپٹی تھی۔ لحاف ایک کونے میں پڑا ہوا تھا۔ چھوٹا بھائی غور سے تھرمامیٹر پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بچے اور دوسرے رشتہ دار دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ چند لوگ دروازے سے جھانکتے بھی نظر آئے میں نے ڈاکٹر سے پوچھا "کیا بات ہے۔"

جواب ملا "کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بخار کچھ بڑھ گیا تھا۔ اب کم ہے۔ آپ آرام کیجیے۔" ڈاکٹر نے کچھ ہدایتیں دیں اور اپنا بیگ سنبھالے باہر چلے گئے۔ ڈاکٹر کے پیچھے ایک کے بعد ایک سبھی باہر جانے لگے۔ کمرے میں صرف بیوی رہ گئیں۔ آنکھیں غماز تھیں کہ وہ خوب روئیں ہیں۔ بیوی قریب آئیں "اب طبیعت کیسی ہے"

"ٹھیک ہوں۔ مجھے بتاؤ تو سہی کیا ہوا تھا اور آپ روئیں کیوں"

"کچھ نہیں۔ نیند لگنے کے بعد آپ کا بخار بڑھ گیا اور آپ بڑبڑانے لگے۔"

"بڑبڑانے لگا" مجھے تجسس ہوا کہ میں نے کیا بڑبڑی۔ اصرار کرنے پر بیوی نے بتلایا۔

"آپ بار بار میرا نام لے رہے تھے" بیوی کی آنکھیں بھر آئیں۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میری زبان پر کوئی اور نام نہ آیا۔ ریکھا یا نیلی کا نام بھی آسکتا تھا۔ میں نے بیوی سے کہا "نیند اور حالت بیماری میں بھی آپ میرے کتنے قریب ہیں۔ یہ تو خوشی کی بات ہے۔ آپ روئیں کیوں۔"

بیوی کے آنسو جو تھم رہے تھے بہ نکلے "آپ نے کئی مرتبہ کہا کہ میرے بعد تمہارا اور بچوں کا کیا ہو گا۔" بیوی باقاعدہ رونے لگیں۔

میں بیوی کو سمجھانے لگا "ایسے پریشان ہو کر رویا نہیں کرتے۔ انسان کو حقیقت پسند ہونا چاہیے۔ آج نہ سہی ایک نہ ایک دن تو ایسا ہو گا۔"

بیوی نے میرا منہ بند کرتے ہوئے کہا "خدارا ایسی باتیں نہ کیجیے۔ آپ کے بغیر ہمارا کیا ہو گا۔ میں اس تصور سے بھی لرز جاتی ہوں۔ ہم جو بھی ہیں آپ کی بدولت ہیں۔ میری خوشی، میری زندگی، میرا سنگھار اور میرا سب کچھ آپ کے دم سے ہے۔ آپ نہیں تو میں بھی نہیں آپ سلامت رہیں۔ میری عمر بھی آپ کو لگ جائے آپ ایسی باتیں نہ کیجیے"

پہلی مرتبہ مجھے مجازی خدا کے معنی معلوم ہوئے اور مجازی خدا ہونے کا احساس بھی ہوا۔ میں نے ممنونیت سے بنت حوا کی جانب دیکھا اور اس کی عظمت کو سلام کیا۔

بیوی نے میرے ماتھے کو چھو کر بخار کا اندازہ کیا اور تھرمامیٹر منہ میں رکھ دیا کہ میں مزید بدشگونی نہ کروں۔ دو منٹ بعد بیوی نے تھرمامیٹر نکال کر دیکھا۔ بخار اب بھی زیادہ تھا۔ میرے سر پر بھیگی تولیہ کو بدلا اور پینے کے لیے پانی دیا۔

مجھے ڈاکٹر اور دیگر رشتہ داروں کی موجودگی کی وجہ سمجھ میں آئی۔ احباب سے بات کر کے میں نے ان کی پریشانی دور کی۔ بیوی سے کہا کہ آدھی سے زائد رات گزر چکی ہے۔ آرام کر لیں۔ بیوی نہ مانیں۔ بقیہ رات سرہانے بیٹھی تولیہ بھگو کر سر پر رکھتی رہیں ماتھے کو چھو کر بخار کا اندازہ کرتیں، وقتاً فوقتاً تھرما

میٹر منہ میں رکھتیں' پندرہ بیس منٹ سے پانی' ہریرہ یا شوربہ پلاتیں اور گھنٹہ بعد مصلیٰ بچھائے ہاتھ اٹھائے میری صحت کے لیے دعائیں کرتی رہیں۔

صبح ہوئی' بخار کچھ کم ہوا۔ بیوی نے مجھے چھوڑ کر بچوں کی خدمت میں لگ گئیں۔ بیوی نے ڈاکٹر کو بلوا بھیجا۔ ڈاکٹر آنکھیں ملتے مجھے دیکھنے آئے۔ معائنہ کیا اور کیفیت پوچھی میں نے جواب دیا۔ "طبیعت کافی بہتر ہے لیکن رات نیند نہیں آئی۔"

ڈاکٹر نے کہا "آپ اکیلے ہی نہیں دوسرے بھی رات نہ سو سکے"

اس دوران بیوی آگئیں اور ڈاکٹر سے میری صحت کے تعلق سے مختلف سوالات کرنے اور مشورے دینے لگیں۔ "بخار اب تک کم کیوں نہیں ہوا۔ شاید معائنوں کی ضرورت ہے۔ سر پر ٹھنڈی تولیہ رکھنے سے نمونیا تو نہیں ہوگا۔ کھا کچھ نہیں رہے ہیں۔ بھوک لگنے کے لیے دوا میں گنجائش رکھیے گا۔"

ڈاکٹر جمائیاں لیتے ہوئے بیوی کی باتوں کو نظر انداز کر گئے۔ اور جب انہیں موقع ملا تو کہا "مریض کی حالت بہت حد تک سنبھل چکی ہے لیکن لگتا ہے آپ تھک گئیں ہیں۔ میں ایک قرص دیتا ہوں۔ تھکن دور ہو جائے گی۔ پھر آپ چاق و چوبند مریض کا خیال رکھ سکیں گی۔" ڈاکٹر نے اپنی نگرانی میں بیوی کو گولی کھلائی۔ بیوی کے جانے کے بعد مجھ سے کہا "میں نے بیگم صاحبہ کو نیند کی گولی دی ہے۔ وہ سو جائیں تو آپ بھی آرام کرلینا۔"

اور ہوا بھی یہی۔ بیوی گولی کھا کر سو گئیں مجھے بھی نیند آگئی۔ چھ گھنٹے سے زائد نیند پوری کرنے کے بعد بیوی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ تھرمامیٹر سے درجہ حرارت معلوم کیا۔ بخار اتر چکا تھا۔ سر سرد تھا اور نہ اعضاء شکنی لیکن ناک کا سڑ سڑ کرنا باقی تھا۔ میں نے بیوی سے کہا "بھوک لگی ہے"

بیوی خوش ہوئیں "بھوک صحت کی علامت ہے" دوڑ کر کچن میں گئیں۔ دودھ' ڈبل روٹی اور میوہ اٹھا لائیں۔ میں بلبلا کر رہ گیا۔ یوں ہی مزید دو دن مجھے زبردستی بستر پر آرام کرنا اور پرہیزی غذا استعمال کرنی پڑی۔ ڈاکٹر کی ڈاکٹری چلی اور نہ میرا غصہ اور روٹھنا کام آیا۔

عوامی غزلیں

محسن بھوپالی

(۱)

ناحق ہر ایک بات ہے' تم چیختے رہو
طاقت ہمارے ساتھ ہے' تم چیختے رہو

ہم تو کہیں گے غیر ممالک کا ہاتھ ہے
اپنوں کی واردات ہے' تم چیختے رہو

ہم بار بار کہتے رہیں گے کہ دن ہے یہ
یہ تو سیاہ رات ہے' تم چیختے رہو

پرچہ تمہارے نام کا کٹوا دیا ہے اب
اس میں ہمارا ہاتھ ہے' تم چیختے رہو

مانا تمہارے حق میں ہیں ساری شہادتیں
منصف ہمارے ساتھ ہے' تم چیختے رہو

(۲)

وعدوں کے بعد "وعدہ خلافوں" کا دور ہے
مضمون کا نہیں' یہ لفافوں کا دور ہے

اک پنشن ہے اپنی جگہ پر رُکی ہوئی
حالانکہ ہر طرف یہ اضافوں کا دور ہے

سرداروں' چوہدریوں' وڈیروں کا ہے یہ عہد
حیرت ہی اس میں کیا ہے جو "صافوں" کا دور ہے

بے آسرا کے سر سے تو چادر بھی چھن گئی
مولانا کہہ رہے ہیں لحافوں کا دور ہے

سب کچھ ہے اس کے واسطے جو ساتھ چھوڑ دے
کہتی ہے خلق "وعدہ معافوں" کا دور ہے

محسنؔ جو سر جھکا کے چلے منہ کی کھاؤ گے
گردن اٹھا کے چلئے زرافوں کا دور ہے

مولوی ان کلب

عنایت علی خان

(کراچی کلب میں اپنے نام سے منسوب مشاعرے کے حوالے سے)

یوں مولوی کا جشن کلب میں منائیں گے

محفل میں ممبران کے جوڑے(۱) جو آئیں گے
پہلے تو اُن کو باہمی "ہیلو" کرائیں گے
پھر چاندنی پر سب کو دوزانوں بٹھائیں گے
تبلیغیوں کی طرح سے کلمہ پڑھائیں گے

یوں مولوی کا جشن کلب میں منائیں گے

اچکن پہن کے آئیں گے ہم سارے ممبران
چیونگ گم کی طرح چباتے رہیں گے پان
تالی بجا کے داد اُسے دیں گے مہمان
اک "الٹرا ماڈرن" سے تلاوت کرائیں گے

یوں مولوی کا جشن کلب میں منائیں گے

ہوگا یہ اپنی طرز کا واحد مشاعرہ
شاعر تو بیں ہوں گے مگر ایک شاعرہ
ہوگا مزاح و طنز کا گرچہ مظاہرہ
پر داد میں خشوع سے سب سر ہلائیں گے

یوں مولوی کا جشن کلب میں منائیں گے

چھڑکیں گے عطر میکسیوں پر گلاب کا
تارِ نگاہ کام کرے گا حجاب کا
مدّت سے چونکہ بند ہے پرمٹ شراب کا
بوتل میں "جن" کی ڈال کے زمزم پلائیں گے

یوں مولوی کا جشن کلب میں منائیں گے

اور آپ پوچھتے ہیں جو "مینو" کے باب میں
بس مختصر سی بات یہ سنیے جواب میں
کٹلس بنا کے رکھیں گے شامی کباب میں
حلوے میں چاکلیٹ فلیور ڈلائیں گے

یوں مولوی کا جشن کلب میں منائیں گے

(۱) دعوت نامہ جوڑوں ہی کے لئے تھا

قلمے و کتابے

کتاب اچھی لگی۔ صفحوں پہ صفحے یوں الٹتے چلے گئے جیسے جاپانا سلک کے سرکتے رنگ رنگ کے تھان کسی بہت اچھے سیلزمین نے گاہک کے سامنے بچھا دیئے ہوں۔ اور زیر لب کہہ رہا ہو۔

"خالی ہاتھ نہ جانے دوں گا۔ کب تک Resist کرو گے؟"

اصلی سلک اور وہ بھی رنگین۔ چیز ہی ایسی ہے۔ بوجھل نہیں۔ سبک اور خوشگوار۔

یوں بھی "رنگ پچکاری" عین مارچ کے آخری ہفتے میں ملی۔ عروج پہ آئی بہار کے سارے رنگ میرے سٹڈی روم میں اتر آئے۔ بکھر گئے۔ جذب ہو گئے۔ وہی تازگی' نکھار' خوشبو جو شیشے سے باہر تھی۔ کھڑکی سے دکھائی دیتی تھی۔ کتاب کھولی تو ـــــ چھن چھن کے دھوپ کی کرنوں کے سنگ اندر آنے لگی۔ شوخ تحریر سے بہار مسکرانے لگی۔

ابدال بیلا کا نام خاصا چونکا دینے والا ہے۔ جیسے کہانیوں کے اچھوتے کردار کا نام۔ افسانوی سا۔ ادبی سا۔ اگر نام والدین نے تجویز کیا تو وہ خاصے دور اندیش ہوں گے۔ بچپن میں ہی صاحبزادے میں ادبی جراثیم دریافت کر لئے ہوں گے۔ اس پر متضاد کہ جناب پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہیں۔ اور وہ بھی باوردی۔ وردی پر ہمیں اعتراض نہیں کہ قد کاٹھ' حلیہ میڈیم نور جہاں کے جنگ 1965ء کے جنگی ترانوں کے ڈھول سپاہی پر فٹ بیٹھتا ہے۔ شخصیت' پیشے' نام اور ادب سے لگاؤ کا رنگا رنگ تضاد کا شاک ہی کافی تھا کہ خبر ملی ادیب صاحب کئی اور محاذوں پر برسرپیکار ہیں۔ M.B.A' جرنلزم' ابلاغیات' بشریات اور نجانے کیا کیا۔

کتاب کا نام پڑھتے ہی انجانے میں خیال جناب ممتاز مفتی صاحب کی طرف گیا۔ صفحہ 52 پر میرے شک کی تصدیق ہو گئی۔ کتاب میں دلچسپی اور بڑھ گئی۔ جب بیلا کو جناب ممتاز مفتی سا رازداں ملا ہو اور یہاں ہر کہانی میں ایک دل ربا موجود۔ غرض خوب ہلا شیری اور مورال سپورٹ۔ کہانیاں ادیبوں کے ارد گرد بکھری رہتی ہیں۔ جھولی میں پڑی ہیں۔ شوکیسوں' ڈرائینگ روموں میں سجی ہیں۔ فٹ پاتھ' گلی کوچوں میں رواں دواں ہیں۔ باغوں سے ویرانوں تک بسیرا کئے ہیں۔ کہانی کی ڈھونڈ مسئلہ نہیں۔ اس کی ٹریٹ منٹ' پیشکش' اظہار ایک آرٹ ہے۔ سلیقہ ہے۔ یہ آرٹ خداداد صلاحیتوں سے جنم لیتا ہوا مشاہدے تجربے اور مطالعے سے نکھر تا جاتا ہے۔ ابدال بیلا کے ہاں اس سلیقے کی کمی نہیں بلکہ زیادتی ہے۔ پھر اس کی کہانیاں کیوں منہ سے نہ بولیں۔ اس کی مرکزی کردار ان لڑکیوں جیسی ـــــ نکھری نکھری تازہ سنوری سجی۔

کردار نگاری' مناظر کشی' کرداروں کی ہر ہر حرکت کو جزیات کی باریک بینی تک نوٹ کرنا لکھنا بیلا کا خاص انداز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب ہاتھ میں آتے ہی وڈیو کیسٹ کا روپ دھارتی ہے۔ آپ آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر اپنے دماغ کے دی۔ سی۔ آر سے بیلا کی وڈیو ٹیپ کا رابطہ جوڑ کر مزے سے سب کہانیاں "دیکھتے" ہیں۔ ڈاکٹر ابدال کی کہانیوں کے ساکت و جامد کرداروں سے لیکر جیتے جاگتے انسانوں تک سب "متحرک" ہیں بلکہ ـــــ

اس کے کردار اس کے سامنے یوں پڑے ہیں جیسے اپریشن ٹیبل پر اس کا مریض۔ ان کے دل کی دھڑکن' سانس کا زیر و بم' پلکوں کی جنبش' پیروں کی بے قراری' ہاتھوں کا اضطراب ـــــ سب کو "مونیٹر" کیا جا رہا ہے۔ محبوبہ سے لیکر پہاڑوں' آبشاروں' غاروں تک کوئی جانے نہ پائے کہ "بیلا" نے افسانوں کے کارخانے میں ایک کلینک بھی کھول رکھا ہے۔ جہاں الٹرا ساؤنڈ' سی ٹی سکین' بلڈ پریشر' ای۔ سی۔ جی اور ایکسرے۔ تمام مشین فٹ کر کے ان کا سرا اپنے دماغ سے جوڑ رکھا ہے۔ یا کہ ابدال بیلا نے اپنے کرداروں کی نبض پہ اپنا ہاتھ رکھ چھوڑا ہے۔ کرداروں کی حرکات و سکنات سے لیکر اندر کا حال' دل کی بات سب SCAN "سکین" ہوتی جاتی ہے۔ کبھی بیلا مجھے ایئر پورٹ سکیورٹی کا سمارٹ افسر لگنے لگتا ہے۔ اس کے کردار "ہینڈ لگیج" کی طرح اس کی چوکنی آنکھوں کے سامنے خودکار کنویئر سے گزرتے ہیں۔ اچانک کہیں "بلیپ" ہوا وہ سامنے لگے ایکسرے کو تاڑنے لگے۔ کڑی نظر ـــــ باریک بینی۔ ـــــ یہ بیلا کا کمال ہے کہ ہیروئن رومانٹک منظر میں پھول سونگھنے کی بجائے پینڈو انداز میں بغیر سٹرا کے فانٹا پیتی بھی اچھی لگتی ہے۔ ورنہ عام زندگی میں یہ عمل دیکھنے اور پڑھنے والے کی حس لطیف کی کمی کھلتی ہے۔

"میٹھے انگور" میں بیلا آپ کو دور دراز وادی کے دو دروازوں اور ایک برآمدے والے گھر لے جاتا ہے۔ اس گھر میں کھیلی جانے والی آنکھ مچولی بلکہ آنکھ مٹکے میں آپ برابر کے شریک ہیں۔ دروازوں کی کنڈیاں خود بخود گرتی ہیں۔ وہ خوشبو کے تعاقب میں اندر جاتا ہے۔ تو متجسس قاری بھی ساتھ ہے۔ پھر بات بڑھ کر تاک جھانک پر آتی ہے۔ آپ خوفزدہ ہو کر باہر برآمدے میں ان دیکھے انسان کے قدموں کی چاپ سنتے ہیں۔ لیکن وہ بے صبرا جھری کی آنکھ سے آنکھ ملائے اس پار کی آنکھ کو تاڑتا ہے۔ آپ اس کے کندھے سے اچک اچک کر اپنی باری کے انتظار میں ہیں۔ جیسے چھوٹے قصبے میں غریب بچہ اپنے ساتھی کو سڑک کنارے "بائی سکوپ" سے آنکھ چپکائے محظوظ ہوتے دیکھے۔ اسی کی فروماتگی نظارا دیکھنے میں حائل ہے۔

وہ رنگ کنٹری سن سن کر خوش ہوتا ہے ------ لیس جھری سے آنکھ لگانے کی آپ کی باری آئی تو بیلا صاحب اگلا دروازہ کھول واپس برآمدے میں پہنچ گئے۔ پارے کی طرح متحرک۔۔۔ بے قرار۔

آپ کی متوقع مایوسی کو بھانپتے ہوئے وہ آپ کو "شارٹ کٹ" سے اسپتال کے باہر والے پارک میں لے جاتا ہے۔ جہاں وہ لڑکی اور رقیب روسیاہ گھاس کے تنکے چنتے' گھاس پہ نیم دراز راز و نیاز میں مصروف ہیں۔ اور وہ -------- وہ اپنے اندر کے خود کار وڈیو کیمرے کو "زوم" کئے گھات لگائے بیٹھا ہے۔

اتنے رنگوں کے باوجود بیلا کو کاسنی رنگ کی کمی محسوس ہوئی تو "جنٹلمین واکنٹ" میں اپنے ہاتھ (ڈاکٹر عامر)" کاسنی دھبوں سے رنگ لیتا ہے۔ ان رنگوں میں رنگی ساری لڑکیاں اپنے خالق ہی کی طرح بولڈ ہیں۔ یہاں پہلی بار کراوڈ کو محسوس کر کے اسے اپنی عزت پیاری ہونے لگتی ہے نظر سہنے لگتی ہے تو "بولڈ اینڈ بیوٹی فل" لڑکی بے باکی سے کہتی ہے۔

"سوواٹ" CHALLENGE کرتی ایک رنگین اخبار ---- چلتی پھرتی خبر ----- للکارتی لڑکی۔

انسانوں کو الگ چھوڑ ابدال بیلا نیچر میں جا پہنچتا ہے تو رکتا نہیں۔ بادلوں اور پہاڑوں کی آشنائی' پتھروں سے جڑی بوٹیوں تک مشاہدے کی زد میں لئے وہ کسی کاؤ بوائے ہیرو کی طرح لانگ شوز پہنے بیچے پتھروں کو پھلانگتا اترتا ہے۔ آپ بھی Clumsy طریقے سے اس کے پیچھے ہیں۔ "تعمیل ارشاد" میں مہم جوئی عروج پہ ہے۔

کھو کھلے پہاڑ کی کھوہ میں پانی گرتا ہے۔ وہاں اندھیرا ہے۔ اسرار ہے۔ یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ عمودی چٹانوں پہ مہارت سے پہاڑی بکریوں کی طرح چڑھتی پہاڑی گنوار لڑکی اس کے قریب آ کر موم کی بن گئی۔ پگھلنے لگ گئی ---- اچانک

"رنگ پچکاری" کی وڈیو کیسٹ پر PAUSE کا بٹن دب گیا۔ بیلا وادیوں' جھرنوں میوں کے باغات' گوری لڑکیوں اور وِدر آل والی ساتھیوں کو چھوڑ چھاڑ "زاد راہ" لئے الگ تھلگ ہو گیا۔ دور افتادہ کھڑے FORMIDABLE پہاڑ کی طرف نکل پڑا۔ جانتے ہوئے کہ یہ عام وادی نہیں۔ یہاں نہ چمکیلی دھوپ ہے نہ گھرے بادل۔ آسمان کا رنگ کیسا ہے؟ سب واضح بھی ہے مبہم بھی۔

مہم جو دھن کے پکے ابدال کو "میکنیاز گولڈ" کے ہیرو کی طرح اس پر سرار سمت جانے میں کوئی خوف نہیں۔ جہاں قدم دھرتے دھرتی ہلنے لگتی ہے۔ بڑے بڑے پتھر لڑھکنے لگتے ہیں۔ اندر باہر کی دنیا درہم برہم ہونے لگتی ہے۔

اسے وہاں وہ ہاتھ بھی نظر آتے ہیں۔ جو زندگی کے پلیٹ فارم پر رہ گئے۔ وہ ہاتھ جو زندہ ہوں تو "وقت کی زمین پر سوئیاں جن کی رفتار سے چلتی ہیں"" زاد راہ پر کیسٹ کا PAUSE ختم ہوا تو آپ "شام سے کی دھوپ" میں نکل آئے۔ جہاں پھر رنگوں کا ڈیرہ ہے اور آپ۔ آپ کے ساتھ رنگ کنٹری لئے ابدال بیلا۔ شام سے کی دھوپ کی چمک میں عجب کشش ہوتی ہے۔ ایسے میں لوڈشیڈنگ کا سے ہو گیا۔ میں نے ایمرجنسی لائٹ جلائی۔ کتاب کے حروف "فلورے سینٹ" رنگوں کی طرح دہکنے لگے۔ کتاب خود بولنے لگی۔

کتاب رکھی تو سوچا ابدال بیلا!

آپ کو "زاد راہ" کی کیا جلدی ہے۔ اس پہاڑ کی جانب ابھی نہ جاؤ۔ ورنہ جب وہاں سے واپس آؤ گے تو سڑکوں پر تمہارے پڑھنے والوں نے اشتہار لگا رکھے ہوں گے۔

ابدال بیلا واپس گھر آ جاؤ۔ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا"

چشم تصور نے دیکھا کہ بیلا ان اشتہاروں پہ لگی اپنی "مونچھ مروڑ" تصویر کے قریب سر نیواڑے بیٹھا ہے۔ اوور آل پہنے لڑکیاں وہاں سے گزرتی ہیں۔ اپنی زبانیں نچلے دانتوں کے پیچھے رول کر کے ---- "چچ چچ" کرتی مونچھ مروڑ تصویر کے پاس سفید بھوؤں اور سفید بالوں والے "بابے" کو دیکھ کر پاس سے گزر کر جاتی ہیں۔ ایسے میں ان کی کرسٹل جیسی گردنوں سے روح افزا کے قطرے نہیں ٹپکتے۔ بلش آن نہیں ہوتا۔ ملائی جیسے رنگ میں گلابی رنگ نہیں ملتا ------ نہ تاریں شارٹ سرکٹ ہوئیں نہ شرارے اٹھے۔ یہ سب لڑکیاں "گفٹ پیک" ہو کر دور چلی جائیں گی۔ پھر ہم آپ بیلا سے کیا سنیں گے؟ "زاد راہ" کے وہ ہاتھ جو ظالم کے ہاتھ ہیں۔ طاقت ور کے ہاتھ ہیں۔ ان سے ہمیں کیا لینا دینا! یہ ہاتھ کبھی دنیا سے رخصت نہیں ہوتے۔ یہ کینسر Cells کی طرح ملٹی پلائی ہوتے جاتے ہیں۔ ان کی کھلی مٹھیوں میں بھی زر و دولت کے انبار ہیں۔ طاقت کا نشہ ہے۔ ہم ابدال بیلا کے ہاتھوں میں رنگ پچکاری دیکھنا چاہتے ہیں۔

ابدال بیلا آپ ہنسو مسکراؤ ---- ورنہ گوری لڑکیاں اور باغ میں بیلے کی کلیاں ناحق سانولی ہو جائیں گی۔

ویڈیو کیسٹ بک

ابدال بیلا کی رنگ پچکاری

غزالہ جاوید

چھٹی کل پاکستان اہل قلم کانفرنس کا انعقاد

عطیہ افروز

اکادمی ادبیات پاکستان کے زیر اہتمام چھٹی کل پاکستان اہل قلم کانفرنس 9 تا 11 اکتوبر 1994ء اسلام آباد میں منعقد ہوئی جس میں ملک کے کونے کونے سے قریب سات سو ممتاز اہل قلم نے شرکت کی۔ کانفرنس میں قومی ادبی مذاکرہ پاکستانی ادب میں مزاحمتی رویے ادب اور اکیسویں صدی اور پاکستانی ادیب کے مسائل کے عنوانات کے تحت چار نشستیں ہوئیں پہلی نشست ---- ادب اور جمہوریت اتوار 9 اکتوبر 1994ء تین بجے سہ پہر نیشنل لائبریری آڈیٹوریم اسلام آباد میں منعقد ہوئی۔ پریزیڈیم ممتاز مفتی' احمد ندیم قاسمی (بوجوہ شامل نہیں ہو سکے) شیخ ایاز شوکت صدیقی' عبداللہ حسین' عبداللہ جان جمالدینی' قلندر مومند' ہاجرہ مسرور پر مشتمل تھی مقالات۔ بشیر الحیدری' زاہدہ حنا' ڈاکٹر انوار احمد' سلیم راز' انور سجاد' ظہیر کاشمیری

دوسری نشست سوموار 10 اکتوبر

پاکستانی ادب میں مزاحمتی رویے کے عنوان سے صبح 10 بجے منعقد ہوئی پریزیڈیم کرار حسین' ابراہیم جویو' جمال ابڑو' قتیل شفائی' یوسف شاہین' احمد راہی' احمد فراز' الطاف فاطمہ' حمید اختر' کے ذمہ تھی۔ مقالات۔ اردو شاعری فہمیدہ ریاض' اردو نثر ڈاکٹر مرزا حامد بیگ پنجابی ادب افضل توصیف' سندھی ادب قاضی امر جلیل' پشتو ادب ڈاکٹر محمد اعظم اعظم' بلوچی ادب عبداللہ جان جمال الدینی' کشمیری ادب طارس باسانی' سرائیکی ادب ڈاکٹر طاہر تونسوی ہندکو ادب مختار علی نیئر' بلتی' کھوار شنار' بروشکی' سید محمد عباس کاظمی' پاکستانی انگریزی

ادب جیلانی کامران، گجراتی ادب کھتری عصمت، علی پٹیل

تیسری نشست کا اہتمام پیر 10 اکتوبر بوقت تین بجے سہ پہر

ادب اور اکیسویں صدی کے عنوان سے تھا۔

پریزڈیم انتظار حسین، منیر نیازی، افراسیاب خٹک، افضل احسن رندھاوا، جام ساقی، نادر قمبرانی، خیرالنساء جعفری، رسول بخش پلیجو، مقالات ڈاکٹر عرش صدیقی، فرخندہ لودھی، رضی عابدی، عزیز محمد بگٹی، ہاشم بابر، ڈاکٹر سحر انصاری، احمد سلیم، فہمیدہ حسین، نے پڑھے

چوتھی اور آخری نشست منگل 11 اکتوبر 1994ء صبح

10 بجے شروع ہوئی موضوع تھا پاکستانی ادب کے مسائل پریزیڈیم غلام مصطفیٰ شاہ "جسٹس ریٹائرڈ" خدا بخش مری، ظفر اقبال، زیتون بانو، ڈاکٹر آفتاب احمد خان، خالدہ حسین، جانباز جتوئی، جاوید شاہین، مستنصر حسین تارڑ مقالات بہادر خان، کشور ناہید، منو بھائی، سوبھو گیان چندانی، ڈاکٹر لئیق بابری، ضمیر نیازی، آئی اے رحمن، مسعود مفتی، اور حمید اختر نے پڑھے۔

اس کانفرنس کی اہمیت کا اندازہ اس طرح بھی ہوتا ہے کہ اس کا افتتاح صدر مملکت جناب فاروق احمد خان لغاری نے کیا اور وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کا تحریری پیغام ان کی معاون خصوصی بیگم شہناز وزیر علی نے پڑھ کر سنایا۔ صدر مملکت کی جانب سے اکادمی ادبیات کے لئے ایک کروڑ روپے کے عطیہ کا اعلان کیا گیا۔ جناب صدر کی جانب سے جن دانشور اور ادیبوں میں اعزازات تقسیم کئے گئے ان میں سے چند نام:۔ ڈاکٹر انور سدید، حمایت علی شاعر، افضل حسین رندھاوا، پروفیسر ایاز قادری، سمندر خان سمندر، ڈاکٹر عبدالحق، سید ہاشم شیراز قیصر، ممتاز مفتی، پرتو روہیلہ، ڈاکٹر سرفراز قاضی، الحاج رحیم بخش قاضی، زیتون بانو، جانباز جتوئی، محمد حسین، ڈاکٹر افضل اقبال، قدرت اللہ شہاب (مرحوم) ڈاکٹر ایوب قاضی، پروفیسر ریاض مجید، سلیم احمد، افضل توصیف، اور ڈاکٹر حامد علی بہت سی تصانیف پر بھی ایوارڈ دیئے گئے بابائے اردو ایوارڈ "اردو نثر" مشتاق یوسفی کی کتاب "آب گم" علامہ اقبال ایوارڈ "اردو نظم" احمد فراز کی کتاب "پس انداز موسم" وارث شاہ ایوارڈ "پنجابی" "چڑیاں دی چھاں" ارشد چہال شاہ عبداللطیف بھٹائی ایوارڈ "سندھی" "کندھی کنول ترنگ" مصنف محمد حسین کاشف، خوشحال خاں ایوارڈ پشتو" "سنگنی" امیر حمزہ شنواری (مرحوم) مست توکلی ایوارڈ "بلوچی" "کلین جار زات" عبدالمجید گواری، خواجہ فرید ایوارڈ سرائیکی "ویندی رت دی شام" مصنف حفیظ خان اور پطرس بخاری ایوارڈ فیض احمد فیض کی شاعری پر انگریزی کتاب کے مصنف امداد حسین کو دیا گیا۔

کانفرنس کے اختتام پر مندرجہ ذیل قراردادیں متفقہ طور پر منظور کی گئیں۔ 1973ء کے آئین کو مکمل طور پر بحال کیا جائے زرعی اصلاحات کے موثر پیکج کے اعلان کے ساتھ اراضی کی حد ملکیت کو مزید کم کیا جائے قومی زبان اردو کو رابطہ کی زبان کے طور پر تسلیم کرنے کے ساتھ سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کیا جائے اور اسے عملی طور پر رائج کیا جائے ملک میں مروج تمام مادری زبانوں کو پاکستانی کی قومی زبانیں قرار دیا جائے۔ ملک کی تمام زبانوں کو ابتداء سے اعلیٰ سطح تک ذریعہ تعلیم بنایا جائے اور ساتھ ساتھ فنکشنل انگریزی تعلیم بھی جاری رکھی جائے فارسی عربی کی اہمیت اور پاکستانی ادب وثقافت پر ان کے اثرات کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی تعلیم کا خصوصی بندوبست کیا جائے الیکٹرانک میڈیا کو مکمل طور پر خود مختار بنایا جائے اکادمی ادبیات پاکستان میں کل وقتی دارالترجمہ قائم کیا جائے۔ حکومت کے زیر نگرانی کام کرنے والے اشاعتی اداروں میں کتابوں کی اشاعت کے کام کو مربوط کیا جائے قبائلی علاقوں میں رائج قانون۔ ایف، سی آر کو کالعدم قرار دیا جائے پاکستان میں اقلیتوں کو مساویانہ حقوق دیتے ہوئے جداگانہ طریقہ انتخاب ختم کیا جائے سیاست خصوصاً سندھ میں فریقین کے درمیان محاذ آرائی پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے افہام و تفہیم مذاکرات اور بھائی چارے کا مطالبہ کیا گیا ملک کے مختلف شہروں میں اہم شاہراہوں کو متقبل اہل قلم کے نام سے منسوب کیا جائے براہوی اور دوسری تمام زبانوں کی اہمیت بحال کی جائے معذور ادیبوں اور دانشوروں کی مالی امداد مقرر کی جائے کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں مصنفین کی مالی مشکلات دور کی جائیں وزارت تعلیم میں تعلیم بالغاں کا شعبہ بحال کیا جائے قائداعظم اکیڈیمی بابائے قوم کی تقاریر کو کسی ردوبدل کے بغیر شائع کرنے کے ساتھ عوام کو کم قیمت پر فراہم کرے۔ اس کانفرنس میں شرکت کرنے والے تمام مندوبین کو اکادمی ادبیات پاکستان کی بنیادی رکنیت دی جائے۔ اور انہیں کارڈ جاری کئے جائیں اجلاس کے آخر میں کشمیر اور بوسنیا کے عوام پر مظالم کی پر زور مذمت کی گئی۔

اختتامی اجلاس سے اکادمی کے چیئرمین جناب فخر الزمان نے خطاب کرتے ہوئے تمام شرکاء کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کانفرنس میں منظور کی جانے والی قرار دادوں پر عمل درآمد کا یقین دلاتے ہوئے مارچ 1995ء میں ایک بین الاقوامی ادبی و ثقافتی کانفرنس منعقد کرانے کی نوید سنائی۔ بہت سی خامیوں کوتاہیوں اور چند بلند پایہ اہل قلم کی عدم شرکت کے شدید احساس کے باوجود کامیاب ادبی کانفرنس منعقد کرانے پر ہم ادارہ چہارسو کی جانب سے اکادمی ادبیات کے چیئرمین جناب فخر الزمان ڈائریکٹر جنرل جناب افتخار عارف اور ان کے تمام رفقاء کرام کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

رس رابطے

شمیم رومانی

برادر عزیز۔ گلزار جاوید

اس سے قبل "چہار سو" کے بیس (20) نسخوں کی رسید بھیج چکا ہوں۔ پرچہ تفصیل سے اب دیکھا ہے ماشاءاللہ آپ نے اس کے لئے مواد کے انتخاب میں اور ترتیب و تشکیل میں محنت اور محبت سے کام لیا ہے۔ 56 صفحوں کو خوب بنا سجا کر پیش کیا ہے۔ یہ شمارہ خاص آپ کی اور برادر بزرگ سید ضمیر جعفری کی طرف سے ارمغان کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ اب تک محشر محسن دلاور کے گوشے بھی شائع کر چکے ہیں۔ یہ آپ لوگوں کی وسیع القلبی اور عالی ظرفی کا ثبوت ہے۔ کراچی اپنے جواہر قابل کی قدر کرنا نہیں جانتا (مستثنیات کو چھوڑ کر) اس کے برعکس ٹانگ کھینچنے (Leg Pulling) کا ماہر ہے۔ ایسے میں حرف قبول اگر پنڈی سے آئے تو یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ ہماری برادری کے کچھ لوگ ابھی تک انصاف، دیانت، محبت، شرافت نفس اور غیر جانبداری کے اصولوں پر کاربند ہیں۔ اور ان کے نزدیک ادب میں تنگ نظری اور تنگ ظرفی کا کوئی جواز نہیں ہے۔

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

میں اس شمارے کی اشاعت پر (اور اس سے قبل کے خصوصی شماروں کی اشاعت پر بھی) نہ صرف آپکا شکریہ ادا کرتا ہوں بلکہ مبارکباد بھی پیش کرتا ہوں۔

انتخاب کلام میں بس ایک ہی کسر رہ گئی کہ "جریرہ" کا انتخاب یا اس کے بعد کا میرا بیشتر (تازہ) کلام اس میں شامل نہیں ہے، جس کے سبب حاسدوں کی آنکھیں میں چمک پیدا ہوئی ہے۔ مگر میں اپنے اس کلام کو جو اس انتخاب میں شامل ہے Disown نہیں کرتا۔ یہ میری تخلیقی تاریخ کا حصہ ہے۔

ظاہر ہے کہ شاعر، فکری اور حسی تجربات کے ساتھ ساتھ Grow کرتا ہے۔۔ میری موجودہ شاعری یقیناً ابتدائی رنگ کلام سے کافی مختلف ہے۔ میں نے بعض دوسرے شعراء کی طرح ٹین ایجرز کا شاعر بنے رہنا پسند نہیں کیا اور اپنی مقبولیت کو معیار نہیں بنایا۔ آدمی کے ساتھ ساتھ اس کی شاعری کی بڑھوتی بھی ہوتی رہتی ہے اور ہوتی رہنی چاہیئے!

اب اگر کوئی عیب جو ایک خاص عہد کی شاعری کو پیش نظر رکھے اور بیچارے شاعر کی زندگی بھر کی کمائی کو نظرانداز کر دے تو اسکو جہل یا تعصب کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے!

بہرحال یہ شمارہ یہاں بہت پسند کیا گیا۔ ایک خصوصی محفل میں اس پر تفصیل کے ساتھ گفتگو بھی ہوئی۔ مجموعی رائے یہی ہے کہ آپ ایک اہم کام کر رہے ہیں، جس کی صحیح معنیٰ میں قدر منزلت آگے چل کر ہوگی۔ آپ کو اور آپ کے پرچے کو تاریخ ادب میں حوالے کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔

دلاور فگار نے اپنے گوشے کے جواب میں جو نظم نذر کی ہے وہ انھیں کا حصہ ہے میں بھی ان سے متفق ہوں کہ:

آپ کرتے ہیں خدمتِ اُردو
ہم سے کیا ہو سکا بجز "یاہو"
ادبی پرچہ ہے یہ معیاری
رہے پیہم "چہار سو" جاری!

دوسرے مندرجات میں سید ضمیر جعفری صاحب کے سفرنامے کی ایک قسط (بحر اوقیانوس کے اس پار) اور آپ کا افسانہ (یا افسانہ نما) "سیفٹی اور سیف گارڈ" کا میں نے دلچسپی سے مطالعہ کیا۔ آپ نے ملک اور قوم کی اندرونی تصویر کو اور جعفری صاحب نے حمیرا رحمان کے ادبی نقوش کو جس خوبی کے ساتھ پینٹ کیا ہے، قابل تعریف ہے۔ محسن احسان، شاہین، حمایت علی شاعر، جاوید اقبال ستار، ناصر سلطان اور رفیق سندیلوی کی شعری تخلیقات بھی پسند آئیں۔

محشر بدایونی

مخلصی جناب گلزار جاوید

امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ بہت دنوں کے بعد آپ سے مخاطب ہوں۔ اس لئے خوشی زیادہ ہے۔ "چہار سو" میرا پسندیدہ پرچہ ہے۔ اسے آپ نے خوب سے خوب تر بنا دیا ہے آپ واقعی قابل مبارکباد ہیں۔ عرصے بعد "چہار سو" کی خدمت کا فریضہ انجام دے رہا ہوں۔ آپ کے لئے دعاگو ہوں۔

صہبا اختر

گرامی قدر گلزار جاوید صاحب

"چہار سو" کی وساطت سے، آپ کی ہنرمندی ادب دوستی -- اور محنت شعاری کا اندازہ ہوا۔ ایسی ذہن میں آپ کا خاکہ مرتب کرنے کے لئے کافی ہے۔

چہار سو کے غالباً چار پانچ شمارے مجھے گذشتہ عرصے میں وصول ہوتے رہے ہیں۔

چہار سو کی ایک نمایاں خصوصیت وہ گوشہ تعارف ہے، جس میں آپ ماہ بہ ماہ کسی ادیب یا شاعر کا تذکرہ بطور خاص کرتے رہیں۔ زیر نظر شمارے میں۔ جناب دلاور فگار کا تعارف "کلام ---- اور اکابر فن کے ان کے بارے میں فرمودات۔ خواہ وہ منظوم ہوں یا نثرپاروں کی صورت میں۔ سب کے سب بہت خوبصورت ہیں۔ یوں تو ہمارے عہد میں ضمیر جعفری صاحب انور مسعود صاحب اور جناب دلاور فگار۔ وہ مزاح نگار ہیں۔ جنہیں ہم بلاشبہ اردو ادب کا اثاثہ قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن شاید مزاح نگاری کو سب سے زیادہ فروغ -- ضمیر جعفری صاحب کی ذاتی کوششوں اور خصوصی توجہ سے حاصل ہوا ہے۔

بہرحال ---- دلاور فگار -- ایک ایسے عظیم مزاح نگار کا نام ہے جسے اردو ادب فراموش نہیں کر سکتا۔ ان کے اس مختصر مگر جامع تعارف کے لئے اہل ادب اور اہل نظر آپ کے ممنون و متشکر رہیں گے۔

عنایت علی خان

مکرمی گلزار جاوید صاحب!

دونوں شمارے ایک ساتھ نظر نواز ہوئے گویا "چپڑی اور دو دو" دلاور فگار صاحب جیسے بے نیاز شاعر پر لازم جمع کرنا اچھا خاصا مشکل کام تھا۔ بہرحال مرداں چنیں کنند! ہر شمارے میں ایک وقیع ادبی شخصیت پر گوشہ مرتب کرنا تو اداروں کے بس کی بات نہیں یہ آپ کی کاوش اور مرشدی ضمیر جعفری صاحب کی محبوبیت کا کرشمہ ہے۔

شبنم رومانی صاحب کا گوشہ بھی بڑا جھلملاتا ہے جو طنازی موصوف کے کلام کی پہچان ہے وہی ایک دلاویزی کے ساتھ شخصیت میں بھی ہے۔ مجھے بھی سفر وحضر میں چند بار مصاحبت کا شرف حاصل رہا ہے۔ ایسے مواقع پر بہت سے شرفا کی تحلیل از خود ہو جاتی ہے اور دونوں اجزا شر اور آفت منہ سے بولنے لگتے ہیں لیکن شبنم صاحب کی بے تکلفی بھی نستعلیق اور شبنم کے قطروں کی طرح کدورت سے پاک ٹھنڈی اور درخشندہ ہوتی ہے۔

• آپ کے یہ گوشے میری دانست میں تو ادباء کی قدر افزائی کے ساتھ ساتھ ادب کے طلبہ پر احسان عظیم ہیں کہ شخصیت کے جملہ گوشے اس ایک گوشے میں سمٹ آتے ہیں اور لذت اور رس ہو گوشے کو مات کرتے ہیں۔ نعیم صدیقی صاحب کو ضرور گھیریے اور پوا کچا چٹھا سامنے لائیے۔ ایسی ہمہ جہت ادبی شخصیات فی زمانہ ملنا محال ہیں۔ ان کی تمام جہات کے ساتھ منصہ شہود پر لائیے۔ یہ ان کا وہ حق ہے جو ان کے حلقے کے لوگ ادا نہیں کر سکتے کہ یہ ان کا مزاج ہے نہ خود صدیقی صاحب کا۔

سرفراز شاہد

برادرم گلزار جاوید صاحب!

"چہار سو" کی خوشبو اب ہر سو پھیلتی جا رہی ہے۔ ادبی حلقوں میں اکثر اس کا ذکر رہتا ہے۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔ اس دور میں خالص ادبی پرچہ "نکالنا" تو آسان ہے لیکن اس کو "سنبھالنا" آسان نہیں۔ اس سلسلے میں آپ کی جہد مسلسل قابل ستائش ہے۔

محسن بھوپالی

عزیزم گلزار جاوید

اگست کا شمارہ ملا۔ سب سے پہلے میں نے شبنم رومانی صاحب کا گوشہ پڑھا بڑا تفصیلی اور بھرپور ہے۔ ان پر تو بہت پہلے گوشہ آنا چاہیے تھا لیکن جیسا کہ آپ نے "براہ راست" کے تحت لکھا ہے "فوقیت اور اولیت کا واحد پیمانہ مطلوبات کی بروقت اور کلی فراہمی کے سوا قطعاً کچھ نہیں "یہ ادارتی مجبوری تھی۔

حصہ نظم میں شبنم رومانی کی بعض غزلوں کی کمی محسوس ہوئی خاص طور پر مندرجہ ذیل اشعار والی غزلیں:۔

جس وقت اپنی فتح کا پرچم کرو بلند
ہاری ہوئی سپاہ کو مڑ کر نہ دیکھنا

جب بھی بند کیں آنکھیں کھل گئیں مری آنکھیں
روشنی سے گزرا ہوں بارہا اندھیرے میں!

یا

وقت جب دائرہ کرتا ہے مکمل اپنا
وہی لمحہ جو پرانا ہے نیا ہوتا ہے

شبنم صاحب نے "براہ راست" میں بعض تیکھے اور چبھتے ہوئے سوالات کے جواب بڑی بے باکی سے دیئے ہیں مثلاً ان کا یہ کہنا "ہم نے پاکستان ایک قوم کے لئے بنایا تھا قومیتوں کے لئے نہیں۔ اگر قومیتوں کا نعرہ اس وقت گرمایا جاتا تو پاکستان کبھی نہ بنتا" بڑی جرات کی بات ہے۔ (یہ بات الگ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد

مرحوم اس طرف اشارہ کر چکے تھے!) رس رابطے میں گوشے میں اشاعت یا عدم اشاعت کے تعلق سے بعض خطوط کی اشاعت کا جواز نظر نہیں آتا۔ ان میں ذاتی معروفیتوں اور مجبوریوں کے تذکرے سے قارئین کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اس ضمن میں شائع ہونے والے بعض خطوط بظاہر شان استغناء کے مظہر ہوتے ہیں لیکن بین السطور سے احساس محرومی صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ میں ممنون ہوں کہ رس رابطے کے ذریعے اشفاق احمد ورک نے میرے خط میں درج بعض نکات کا جواب دیا اور معلومات فراہم کیں۔ لاحقہ والا فقرہ میں نے دوبارہ پڑھا لیکن میری "غلط فہمی" قائم ہے!

قصے و کتابے میں ڈاکٹر احسان احمد شیخ کا ایوری درڈ اگلو پر تبصرہ نظر سے گزرا۔ ان کا بلیغ جملہ مکمل تبصرہ کہا جا سکتا ہے۔ مترجم شاعر تک تو پہنچ گیا ہے اس کی آنکھوں میں آنکھیں نہیں ڈال سکا۔ اس کے ذہن کو نہیں پڑھ سکا۔ مترجم راجندر سنگھ ورما سے میری خط و کتابت رہی ہے انہوں نے از راہ محبت میری نظموں غزلوں کے تراجم بھی کئے ہیں لیکن مذکورہ بالا سبب کے باعث اشاعت کے لئے نہیں دے سکا۔ محسن احسان شاہین جاوید اقبال اور تبسم اخلاق کی غزلیں پسند آئیں۔ رفیق سندیلوی کی نظم "فصیلوں کے پیچھے" ایک جاندار اور مکمل نظم ہے۔۔ حمایت علی شاعر صاحب کے ہائیکو تکنیکی ہیئت کے لحاظ سے مثالی ہائیکو ہیں۔ پچھلے دنوں اس ہیئت کی پابندی کے ساتھ بشیر سیفی اور نسیم سحر کے ہائیکو بھی نظر سے گزرے تھے۔ بعض شعراء اس پابندی کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ ماہیا' مثلث یا پھر من پسند ہیئت میں نظم لکھ کر ہائیکو کا نام دے دیتے ہیں جو قطعاً غلط ہے۔ بالکل اس طرح جس طرح ہر چار مصرع والی تخلیق کو ہم رباعی نہیں کہہ سکتے۔

شاہ جی کے سفرنامے کی موجودہ قسط سے میں زیادہ لطف اندوز ہوا کہ پچھلی دفعہ میں بھی حمیرا رحمان صاحبہ کے ہاں نچلی منزل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ ان کا ایک جملہ ان دنوں مشاعرے کی ٹکھیر بھی سسپنڈ رکھی ہے۔ مزہ دے گیا۔ نکال رکھی ہے کے معنوں میں سسپنڈ رکھی ہے ایک مدت کے بعد پڑھا۔ صفحہ بشاشت پر کلیم چغتائی کی "غزل" نے لطف دیا۔

The Government commercial advertisement rate of the Rs. 3000/- per Monthly "Chahar Soo", Rawalpindi has been fixed @ page with effect from September 23, 1994.

الحمد للہ چہار سو A.B.C اور میڈیا لسٹ کے تمام مراحل سے بحسن و خوبی گزرنے کے بعد کامیابی کی جانب طویل سفر کا آرزو مند ہے۔ جس کے لئے آپ کا تعاون اور سرپرستی بے حد ضروری ہے "چہار سو" آپ کے ادارے اور مصنوعات کی تشہیر کا باوقار ذریعہ اور علم و ادب کی خدمت کا مؤثر پلیٹ فارم بھی ہے۔